تدبّر

زیرِ نگرانی

مولانا امین احسن اصلاحی

یکے از مطبوعات

ادارہ تدبرِ قرآن و حدیث

رحمان سٹریٹ مسلم کالونی سمن آباد، لاہور

قیمت تین روپے

تدبّر

زیرِ نگرانی

مولانا امین احسن اصلاحی

یکے از مطبوعات

ادارہ تدبرِ قرآن و حدیث

رحمان سٹریٹ مسلم کالونی سمن آباد، لاہور

قیمت تین روپے

مجلسِ ترتیب:

مولانا امین احسن اصلاحی

خالد مسعود

جاوید احمد

عبداللہ غلام احمد

ماجد خاور

ناشر: ادارۂ تدبرِ قرآن و حدیث

مطبع: شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور

تدبّر

سلسلہ نمبر ۲ — محرم الحرام ۱۴۰۲ھ — مطابق نومبر ۱۹۸۱ء

فہرست مضامین

تذکرہ و تبصرہ:	صفحہ
اسلام کا شورائی نظام ——— خالد مسعود	۳
تدبر قرآن:	
سورۃ بقرۃ - ۲۰ ——— خالد مسعود	۹
فہم قرآن کے لئے چند بنیادی اصول ——— امین احسن اصلاحی / عبداللہ غلام احمد	۱۶
تدبر حدیث:	
حدیث قتال ——— خالد مسعود	۲۵
تزکیۂ نفس:	
تعلق باللہ اور اس کی اساسات - ۲ ——— امین احسن اصلاحی	۳۳
مراسلہ و مذاکرہ:	
معاشی دائرے میں فرد اور ریاست کا کردار ——— امین احسن اصلاحی / راجہ خاور	۴۱
عمل خیر اور عمل شر	
قوموں کے عروج و زوال میں کردار کا حصہ	

تذکرہ و تبصرہ — بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خالد مسعود

اسلام کا شورائی نظام

قرآن مجید میں حکومت و حکمرانی کے بارے میں جو ہدایات ملتی ہیں ان پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں حاکمیت کا مرکز و مرجع اللہ تعالیٰ ہے۔ وہی تنہا ساری کائنات کا مالک و حاکم اور تمام انسانوں کا خالق اور آقا ہے۔ تنہا اسی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ زمین میں اپنے بندوں کے لئے نظامِ زندگی تجویز کرے اور ان کے لئے قانون بنائے۔ زمین میں خدا کی یہ تشریعی حکومت قائم کرنا بندوں پر اس کا حق ہے۔ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ (۵۴۔ اعراف) آگاہ کہ خلق اور امر اسی کا حق ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو چونکہ یہ اختیار دیا ہے کہ وہ چاہیں تو اس کی اطاعت کریں اور چاہیں تو اس کی اطاعت کا قلادہ اتار دیں اس لئے تشریعی حکومت کے معاملے میں بھی اس نے جبر کو پسند نہیں کیا بلکہ اپنے بندوں کو یہ اختیار دیا ہے کہ وہ اس کی غلامی کے فرائض ادا کرنے کے لئے اس کی ہدایات کے مطابق ایک نظام حکومت قائم کریں جس میں خدا اور رسول کے بتائے ہوئے احکام و شرائع کو نافذ کریں۔ اس اختیار دینے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ خدا نے حاکمیت کا حق انسانوں کے سپرد کر دیا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو خداوند تعالیٰ قرآن میں ان کے ناحق تصرفات کو ظلم و عدوان، بغاوت، طغیان اور فساد سے تعبیر نہ فرماتا۔ پس معلوم ہوا کہ اسلام میں حکومت کا منصب بہرحال ایک امانت ہے جس کا حق صرف اس صورت میں ادا ہوتا ہے جب حکمران اپنے آپ کو خدا کا بندہ سمجھے، وہ خدا و رسول کی اطاعت میں سرگرم ہو اور جو احکام و شرائع خدا کے رسول کے ذریعہ سے ملے ہیں ان کو بے کم و کاست جاری کرے اور ان میں سرِمو کمی بیشی نہ کرے۔ اس حقیقت کا اظہار خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک خطبہ میں یہ کہہ کر فرمایا کہ میں تمہارے اندر صرف خدا کی شریعت کو جاری کرنے والا ہوں اپنی

طرف سے کوئی نئی بات نکالنے والا نہیں۔ اگر میں کوئی نئی بات نکالوں یا اللہ کے حدود سے انحراف اختیار کروں تو تم میری راہ سیدھی کر دینا۔

اسلام میں حکمرانی کے مذکورہ تقاضوں ہی کی بدولت مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے اولوالامر کی اطاعت کریں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صاحب امر کی اطاعت کو اپنی اطاعت اور اس کی نافرمانی کو اپنی نافرمانی قرار دیا۔ صاحب امر کی یہ حیثیت صرف اس وجہ سے ہوئی کہ وہ خدا کی تشریعی حاکمیت کے زمین میں نفاذ کا ذریعہ بنتا ہے۔

اسلام نے مسلمانوں کے لئے جو نظام زندگی تجویز کیا قرآن وسنت میں اس کے اصول ومبادی متعین کر دیئے گئے ہیں۔ معاملات کی جزئیات وتفصیلات سے نہ ان میں زیادہ تعرض ہی کیا گیا ہے اور نہ ان کا احاطہ ممکن ہی ہے۔ ان جزئیات وتفصیلات کو طے کرنا اور حالات وضروریات کے تقاضوں کے تحت اسلام کے منشا ومزاج کے مطابق اقدامات تجویز کرنا امت کی صوابدید پر چھوڑا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام تنہا سربراہ حکومت کے بس کا نہیں۔ اس کی وسعت، گہرائی اور اہمیت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ صاحب امر کے ساتھ ایسے لوگ اس کی ذمہ داری میں شریک کار ہوں جو اجتماعی، سیاسی اور قانونی معاملات میں اس کو صحیح مشورے دے سکیں اور اس کے کام کو آسان بنا سکیں۔ بذات خود سربراہ حکومت کا کام بھی اس قدر وسیع الاطراف اور پھیلا ہوا ہوتا ہے کہ جب تک ثقہ، اہل اور قابل اعتماد رفقاء کار میسر نہ ہوں کسی شخص کے لئے اس سے عہدہ برآ ہونا ممکن نہیں ہوتا۔ حکومت کی ان ضروریات کے پیش نظر اسلام نے ایک مکمل شورائی نظام کتاب وسنت میں تجویز کر دیا ہے۔

معلوم ہے کہ مکہ میں مسلمان نہایت مظلوم ومقہور تھے۔ جب بعض مسلمانوں کے مدینہ منتقل ہو جانے کے بعد اس بات کا امکان پیدا ہو گیا کہ وہ ایک ہیئت اجتماعی وسیاسی میں منظم ہو سکیں تو ان کو جو ہدایات دی گئیں ان میں نماز اور شورائیت سرفہرست تھیں۔ فرمایا

وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (۳۸۔ شوریٰ)	اور وہ جنہوں نے اپنے رب کی دعوت پر لبیک کہی اور نماز کا اہتمام کیا اور ان کا نظام شوریٰ پر ہے اور جو کچھ ہم نے ان کو رزق بخشا ہے اس

میں سے خرچ کرتے ہیں۔

اس آیت میں نماز کا ذکر ایمان کے مظہر اول کی حیثیت سے ہے اور اجتماعی نظم کے بارے میں فرمایا کہ یہ خود سری، انانیت، خاندانی برتری اور نسبی غرور پر مبنی نہیں جیسا کہ عام طور پر غلط کار معاشرے سمجھتے ہیں اور جیسا قریش سمجھتے تھے، بلکہ اہل ایمان کے باہمی مشورہ پر مبنی ہے چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول وعمل سے شورائیت کے اس نظام کو امت میں رائج فرمایا اور آپ کے خلفاء نے بھی اسی اساس پر اپنا سیاسی نظام قائم کیا۔

سورہ شوریٰ کی مذکورہ آیت میں نماز کے پہلو بہ پہلو شوریٰ کے ذکر سے مولانا امین احسن اصلاحی نے اپنی تفسیر تدبر قرآن میں نہایت لطیف استدلال کیا ہے۔ وہ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ شوریٰ کی وہ کون سی اہمیت ہے جس کی بنا پر اسے نماز کے پہلو میں جگہ دی گئی، لکھتے ہیں:

"ہمارے نزدیک اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اسلام کے نظم اجتماعی کی روح اور اس کے تمثال کی اصلی شکل نماز میں محفوظ کی گئی ہے۔ اسی کے اندر مسلمانوں کو دکھایا گیا ہے کہ کس طرح ان کو اللہ کی بندگی کے لئے ایک بنیان مرصوص بن کر کھڑے ہونا ہے، کس طرح اپنے اندر سے سب سے زیادہ علم وتقویٰ والے کو اپنی امامت کے لئے منتخب کرنا ہے، کس طرح لوگوں کو حدود الٰہی کے اندر اس امام کی بے چون وچرا اطاعت کرنی ہے اور کس طرح امام اس بات کا پابند ہے کہ لوگوں کو کسی ایسی بات کا حکم نہ دے جو اللہ اور رسول کے کسی حکم کے خلاف ہو اور کس طرح اس کے ایک ادنیٰ مقتدی کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ اگر وہ کوئی غلطی کرے تو وہ اس کو ٹوک دے یہاں تک کہ اگر نماز کے کسی رکن، رکوع، سجود، قیام، قعود یا تلاوت میں کوئی ادنیٰ فروگزاشت بھی اس سے صادر ہو جائے تو اس کے پیچھے ہر نماز پڑھنے والا اس کو متنبہ کرنے کا ذمہ دار ہے اور امام کا فرض ہے کہ اگر مقتدی کی تنبیہ مطابق شریعت ہے تو وہ اس کو قبول اور اپنی غلطی کی فوراً اصلاح کرے۔ گویا اس طرح ہمارا پورا نظم اجتماعی نماز کی صورت میں متشکل کر کے ہمیں یہ دکھایا گیا کہ ہم اپنی سیاسی تنظیم میں اسی نمونہ کی پیروی کریں۔ اسی طرح اللہ کے دین کی اقامت کے لئے اپنی تنظیم کریں، اسی طرح اپنے اندر سے سب سے زیادہ اہل اور صاحب علم وتقویٰ کو اپنی قیادت کے لئے منتخب کریں، اسی طرح تمام معروف میں بے چون وچرا اس کی اطاعت کریں اور اگر اس سے کوئی ایسی

بات صادر ہو جو شریعت کے معروف کے خلاف ہو تو بے خوف لومۃ لائم اس کو متنبہ کر کے اس کو صحیح راہ پر لانے کی کوشش کریں۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے طرزِ عمل سے اس شورائیت کی بنا کیسے ڈالی؟ اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ آپ سیاسی و انتظامی معاملات میں اپنے صحابہ سے برابر مشورہ کرتے رہتے تھے۔ آپ کی حوصلہ افزائی ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ صحابہ امورِ مصلحت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ عرض کرتے کہ اگر حضورؐ کا فلاں اقدام وحیِ الٰہی پر مبنی نہ ہو تو اس کی جگہ فلاں تدبیر زیادہ قرینِ مصلحت رہے گی۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ اپنے ساتھیوں سے مشورہ لیتے رہنے والا کبھی کسی شخص کو نہیں پایا۔ آنحضرتؐ نے جس قسم کے معاملات میں صحابہ سے مشورے لئے ان کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ان میں جنگی، سیاسی، اقتصادی اور سماجی ہر قسم کے معاملات داخل ہیں۔ خلفائے راشدین کے دور میں مجلس شوریٰ مسلمانوں کے جلیل القدر اور معتمد و ذی علم نمائندوں پر مشتمل ہوتی تھی اور تمام اہم امور میں اس سے مشورہ لینے کا باقاعدہ نظام قائم کر دیا گیا تھا۔

قرآن مجید نے اہل شوریٰ کی صفات کے ضمن میں مسلمانوں کو تاریکی میں نہیں چھوڑا۔ سورہ نسا میں مندرجہ ذیل ہدایت دی گئی ہے:

وَاِذَا جَآءَھُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِالْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِہٖ وَلَوْ رَدُّوْہُ اِلَی الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓی اُولِی الْاَمْرِ مِنْھُمْ لَعَلِمَہُ الَّذِیْنَ یَسْتَنْبِطُوْنَہٗ مِنْھُمْ

(۸۳ ۔ نساء)

اور جب ان کو امن یا خطرے کی کوئی اطلاع ملتی ہے تو اس کو پھیلا دیتے ہیں اور اگر وہ اس کو رسولؐ اور اپنے اہل حل و عقد کے سامنے پیش کرتے تو اس کو وہ لوگ جو اہل بصیرت ہیں ٹھیک طور پر سمجھ سکتے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اسلامی نظام میں جن لوگوں کے سامنے معاملات پیش کئے جانے چاہئیں، ان کی دو صفتیں متعین ہیں۔ ایک یہ کہ وہ مسلمانوں کے اولوالامر یعنی سربراہ کار ہوں، دوسری یہ کہ وہ اہل استنباط یعنی معاملات کی سوجھ بوجھ اور دینی و سیاسی بصیرت رکھنے والے ہوں تاکہ وہ ہر معاملے میں صحیح رائے قائم کر سکیں اور معاملات کی تہہ تک پہنچ سکیں۔

خلفائے راشدین کے زمانے میں مجلس شوریٰ کے ارکان اگرچہ موجودہ سیاسی مفہوم میں قوم کے منتخب نمائندے نہیں ہوتے تھے، اس لئے کہ اس زمانہ میں انتخابات کا موجودہ طریقہ روشناس نہیں ہوا تھا، لیکن یہ لوگ اپنے اپنے گروہوں کے معتمد نمائندے ضرور ہوتے تھے اور دینی بصیرت، اصابتِ رائے، سیاسی سوجھ بوجھ اور علمی و قانونی مہارت میں ان کے نمایاں مقام کی وجہ سے لوگ اپنے معاملات میں انہی کی طرف رجوع کرتے تھے۔ اس وقت یہ اہل الرائے حکومت کے مرکز میں مجتمع تھے۔ نیز گروہوں اور قبیلوں کے داخلی نظام کی بدولت ان کے لیڈروں کا تعین آسان تھا اس لئے ان کے انتخاب میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی تھی۔ دورِ حاضر میں اسلامی حکومت قوم کے معتمد اور موزوں اشخاص کے تعین کے لئے کوئی جدید طریقہ اختیار کر سکتی ہے جو زمانے کے مذاق کے مطابق ہو۔

اسلام میں خود خلیفہ اور اس کی مجلس شوریٰ چونکہ خداوند تعالیٰ کی تشریعی حاکمیت کو نافذ کرنے والی ہوتی ہے اس لئے اسلام کے ساتھ وفاداری تمام اولوالامر کے لئے ایک ضروری شرط ہے۔ اس سلسلہ میں اہل تحقیق کی رائے یہ ہے کہ وہ چند خصوصیات کے حامل ہونے ضروری ہیں۔......

...مثلاً وہ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہوں، خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کو آخری دینی و قانونی سند مانتے ہوں، اسلام کے احکام و شرائع کے پابند ہوں، تہذیب و معاشرت میں اسلامی اصولوں پر عمل پیرا ہوں اور حلال و حرام کے بارے میں وہ اسلام کے مقرر کئے ہوئے حدود کے پابند ہوں۔ ان خصوصیات سے متصف افراد ہی دین کے لئے اپنی ذمہ داری کو سمجھ سکتے اور اسے ادا کر سکتے ہیں۔

اسلام کے اس شورائی نظامِ سیاست میں بڑی حکمتیں پوشیدہ ہیں۔ اجتماعیت میں شورائیت اس حسنِ ظن و اعتماد کا مظہر ہے جو راعی اور رعایا اور امیر و مامور میں ہونا چاہئے۔ اسی سے استبداد اور سخت دلی کی جڑ کٹتی ہے اور راعی اور رعایا دونوں کی طرف سے وہ تعاون ظہور میں آتا ہے جو استحکام کی بنیاد ہے اور جس سے وحدت و قوت کی برکتیں ظہور میں آتی ہیں۔ اکثریت کی رائے میں فی الجملہ صحت کا گمان غالب ہوتا ہے اس وجہ سے اگر فصلِ نزاعات میں اس کو فیصلہ کن مانا جائے تو مصلحت کے پہلو سے یہ راہ مامون ہے۔ چونکہ یہ راہ خدا کی ہدایت اور رسول اللہ کی سنت کے مطابق ہے اس لئے اسکے اختیار کرنے میں اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہوتی ہے اور اس معاشرے پر خدا کا ہاتھ ہوتا ہے جو اسے اختیار کرے۔

تدبر کے اس شمارہ میں "فہم قرآن کے لئے چند بنیادی اصول" کے عنوان سے جو مضمون شائع کیا جا رہا ہے۔ یہ مولانا اصلاحی مدظلہ کے ایک لیکچر سے ماخوذ ہے جو انہوں نے ادارہ تدبر قرآن و حدیث کے زیر اہتمام دیا۔ یہ ایک سلسلہ کی پہلی کڑی ہے۔ اس سلسلہ کے باقی مضامین انشاء اللہ آئندہ شماروں میں پیش خدمت ہوں گے۔ تقریر میں چونکہ انداز بیان اس انداز سے مختلف ہوتا ہے جو تحریر میں اختیار کیا جاتا ہے۔ اس لئے اس مضمون کی ترتیب میں بہت حک و اضافہ سے کام لیا گیا ہے۔ لہٰذا اس کا مطالعہ مولانا محترم کے افادات کے طور پر کیا جائے ادارہ کے پیش نظر یہ بات ہے کہ فہم قرآن و حدیث کے اصول کے موضوع پر مولانا کے خیالات کو تحریر میں لایا جاتے تاکہ قرآن و سنت کے طالب علم ان سے رہنمائی حاصل کر سکیں اور ان میں تجویز کردہ لائنوں پر مزید غور و فکر کر سکیں۔

بقیہ :۔ سورۃ بقرۃ

بے شک جو ایمان لائے، جو یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صابئی ان میں سے جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان لایا: اور جس نے عمل صالح کیا تو اس کے لئے اس کے رب کے پاس اجر ہے، اور ان کے لئے کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے ۶۲

صابی دین حق سے منحرف ہو کر ملائکہ اور ستاروں کی پرستش میں مبتلا ہو گئے۔ اگر وہ تھا بھی ان کے اندر نماز و عبادت باقی رہ گئی تھی اب اس مذہب کا کہیں وجود نہیں رہا۔

یعنی اللہ تعالیٰ کے ہاں کسی کو بھی کوئی شرف یا تقرب اس کے ذاتی یا خاندانی استحقاق یا کسی گروہ کے ساتھ نسبت رکھنے کی بناء پر حاصل نہیں ہوتا۔ بلکہ صرف ایمان باللہ۔ ایمان بالآخرت اور عمل صالح کی بناء پر حاصل ہوتا ہے۔ خدا کے ہاں ایمان اور عمل صالح کی کسوٹی پر سب سے پہلے پرکھے جائیں گے۔ ان میں مسلمان سرفہرست ہیں۔

تدبر قرآن

خالد مسعود

سورۃ لبقرۃ ۲۰

۳۰ اور یاد کرو جب کہ تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔ ۳۱ انہوں نے کہا کہ کیا تو اس میں اس کو خلیفہ مقرر کرے گا جو اس میں فساد مچائے اور خونریزی کرے۔ ۳۲ اور ہم تو تیری حمد کے ساتھ تیری تسبیح کرتے ہی ہیں اور تیری پاکی بیان کرتے ہی ہیں؟ اس نے کہا میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ۳۰ اور اس نے سکھا دیئے آدم کو سارے نام، پھر ان کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ اگر تم سچے ہو تو مجھے ان لوگوں کے ناموں سے آگاہ کرو ۳۱ انہوں نے کہا کہ تو پاک ہے ہمیں تو تو نے جو کچھ بتایا ہے اس کے سوا کوئی علم نہیں بے شک تو ہی علم والا اور حکمت والا ہے ۳۲ کہا اے آدم! ان کو بتاؤ ان لوگوں کے نام۔ تو جب اس نے بتائے ان کو ان لوگوں

یہاں سے آگے آدمؑ کی خلافت اور ابلیس کی طرف سے اس کی مخالفت کی سرگزشت بیان ہوتی ہے۔ اس میں اس ردعمل کی پوری تصویر موجود ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور نزول قرآن سے یہود پر خصوصاً اور قت کی بعض دوسری جماعتوں پر عموماً نمایاں ہوا۔ یہود نے اپنے حسد و تکبر کے سبب سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں ابلیس کا سا پارٹ ادا کیا۔

خلیفہ اس کو کہتے ہیں جو کسی کے بعد اس کے معاملات سرانجام دینے کے لئے اس کی جگہ لے یہاں خلیفہ بنانے کا مقصود نائب بنانا تھا تاکہ اللہ تعالیٰ اسے زمین کے انتظام و انصرام کے معاملہ میں کچھ اختیارات دے کر اس کی اطاعت و وفاداری کا امتحان کرے

خونریزی فساد فی الارض کا قدرتی نتیجہ ہے۔ تمام عالم انسانی اور پورے کرہ ارضی کے تحفظ کی ضمانت صرف خدا کا قانون دے سکتا ہے۔ جو سب کے جان و مال کی حفاظت کرتا ہے۔ آدم کے اختیار میں اس بات کا امکان تھا کہ وہ خدا کے قانون کی خلاف ورزی کرے۔ فرشتوں نے اپنا یہ شبہ بیان کیا۔

یہ فرشتوں کے سوال کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے اپنی اسکیم کی وضاحت فرمائی۔ ان کو ذریت آدم کا مشاہدہ کرایا۔ اور اولاد آدم میں جو انبیاء و رسل، جو مجددین و مصلحین اور جو شہداء و صدیقین پیدا ہونے والے تھے ان کے بارے میں پوچھا کہ کیا یہ زمین میں فساد پیدا کرنے والے لوگ ہیں۔

کے نام تو اس نے کہا کیا میں نے تم سے نہیں کہا کہ آسمانوں اور زمین کے بھید کو میں ہی جانتا ہوں ۴۰ اور میں جانتا ہوں اس چیز کو جس کو تم ظاہر کرتے ہو اور جس کو تم چھپاتے تھے ۳۳
اور یاد کرو جب کہ ہم نے کہا فرشتوں سے کہ آدم کو سجدہ کرو تو انہوں نے سجدہ ۴۱ کیا مگر ابلیس نے انکار کیا اور کافروں میں سے بن گیا ۴۲ ۳۴ اور ہم نے کہا اے آدم! تم اور تمہاری بیوی دونوں رہو جنت میں اور اس میں سے کھاؤ فراغت کے ساتھ جہاں سے چاہو اور اس درخت کے پاس نہ پھٹکنا ورنہ ظالموں میں سے بن جاؤ گے ۴۳ ۳۵ تو شیطان نے اُن کو وہاں سے پھسلا دیا اور اُن کو نکلوا چھوڑا اس عیش و آرام سے جس میں وہ تھے ۴۴ اور ہم نے کہا کہ اترو۔ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے اور تمہارے لئے ایک وقت خاص تک زمین میں رہنا بسنا اور کھانا برتنا ہے ۳۶ ۴۵ پھر آدم نے پا لیے اپنے رب کی

---

۴۰ آدم اللہ تعالیٰ کے بتانے سے نام جان چکے تھے۔ انہوں نے جب فرشتوں کو اپنی ذریت سے متعارف کرایا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میرا کوئی فعل حکمت اور مصلحت سے خالی نہیں ہے لیکن میرے سارے کاموں کی حکمتوں اور مصلحتوں کو سمجھنا نہ فرشتوں کے لئے ممکن ہے نہ جنوں کے لئے اور نہ انسانوں کے لئے۔

۴۱ یہ سجدہ خدا کے حکم کی تعمیل میں تھا اس لئے گویا خدا ہی کو سجدہ تھا اور اس میں شرک کا کوئی پہلو نہ تھا۔ اس سجدہ کا مقصد فرشتوں کی اطاعت اور بندگی کا امتحان تھا اور وہ اس امتحان میں پورے اترے۔

۴۲ حکم سجدہ میں فرشتوں کے علاوہ جنات بھی شامل تھے۔ ان کے ایک گمراہ فرد ابلیس نے اپنی خلقت کی فضیلت کے پیش نظر سجدہ سے انکار کر دیا۔ اسے یہ خیال نہ آیا کہ اصل عزت و سرفرازی خدا کے احکام کی بے چون و چرا تعمیل میں ہے۔

۴۳ یہ آدم کی اطاعت و فرمانبرداری کا امتحان تھا جو نعمتوں سے بھری ہوئی جنت میں صرف ایک درخت کو حرام ٹھہرا کر لیا گیا۔ یہی حال اس دنیا میں بھی ہے۔ زمین کی ہر نعمت انسان کے لئے مباح ہے صرف گنتی کی چند چیزوں سے روک کر خدا ہماری بندگی کا امتحان لیتا ہے۔

۴۴ انسان جس چیز سے روک دیا جاتا ہے اسی کا وہ زیادہ حریص بن جایا کرتا ہے۔ ابلیس نے آدم کی اسی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اسے حکم عدولی پر اکسایا۔

۴۵ آدم کی لغزش کا نتیجہ جنت سے اخراج کی صورت میں ظاہر ہوا۔ خدا نے آدم و حوا اور ابلیس کو دنیا میں بھیجتے بھیجتے واضح کر دیا کہ تمہارے درمیان فطری تعلق دشمنی کا ہے اور دشمنی ہی کا رہنا چاہئے۔

طرف سے چند کلمات تو اس نے اس کی توبہ قبول کی بے شک وہی توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے ۴۶ ۳۷ ہم نے کہا اترو یہاں سے سب ۴۷ تو اگر آئے تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت تو جو میری ہدایت کی پیروی کریں گے تو اُن کے لئے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے ۳۸ اور جو کفر کریں گے اور جھٹلائیں گے میری آیتوں کو وہی لوگ دوزخ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے ۴۸ ۳۹
اے بنی اسرائیل ۴۹ یاد کرو میری اس نعمت ۵۰ کو جو میں نے تم پر کی اور میرے عہد کو پورا کرو میں تمہارے عہد کو پورا کروں گا۔ اور مجھی سے ڈرو ۴۰ اور ایمان لاؤ اس چیز پر

---

۴۶ آدم اپنی غلطی پر نادم ہوئے۔ اور توبہ کے لئے بے قرار ہو گئے۔ اس پر خدا نے توبہ کے الفاظ ان کے دل میں ڈالے اور ان کی توبہ قبول کر لی۔

۴۷ توبہ کی قبولیت کے بعد اترنے کا یہ حکم آدم کو دنیا میں بھیج کر اس کا امتحان کرنے کی غرض سے تھا تاکہ اولادِ آدم میں سے اس میں پورے اترنے والے جنت کے وارث بنیں اور اس میں ناکام رہنے والے جنت سے محروم رہیں۔

۴۸ آدم کی لغزش سے انسانی فطرت و عقل کا وہ ضعف ظاہر ہو گیا جو اسے وحی الٰہی کی رہنمائی اور انبیاء کی دستگیری کا محتاج ثابت کرتا ہے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ کی رحمت مقتضی ہوئی کہ وہ انسان کی ہدایت اور اصلاح کے معاملہ کو تنہا اس کی فطرت اور عقل ہی پر نہ چھوڑے بلکہ اس کو گمراہی اور گمراہی سے بچانے کے لئے ہدایت کا سامان بھی کرے۔

۴۹ شروع سورہ سے لے کر یہاں تک سورۃ بقرہ کی تمہید یا مقدمہ تھا جس میں یہود کے متعلق اشارات و کنایات کے پردے میں کہا گیا۔ اب یہود کو براہ راست مخاطب کر کے ان کو ان کی ذمہ داریاں یاد دلائی گئیں جو از روئے تورات نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی دعوت سے متعلق ان پر عائد ہوتی ہیں۔

۵۰ نعمت سے مراد وہ فضائل و عنایات ہیں جو بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ نے دنیا کی سیادت و امامت اور شریعت عطا کر کے کیں (مائدہ ۲۰) اور عہد سے شریعت کے علاوہ وہ عہد ہے جو بنی اسرائیل سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان لانے کے بارے میں لیا گیا تھا۔ (اعراف ۱۵۶-۱۵۷)

جو میں نے اتاری ہے تصدیق کرتی ہوئی اس چیز کی جو تمہارے پاس[۵۱] ہے۔ اور تم اس کے سب سے پہلے انکار کرنے والے نہ ہو اور میری آیات کو حقیر پونجی کے عوض نہ بیچو اور میرے غضب سے بچتے ہی رہو۔ اور حق اور باطل کو گڈمڈ نہ کرو حق کو چھپانے[۵۲] کے لئے دراں حالے کہ تم جانتے ہو۔ اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو[۵۳]۔ کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو اور حال یہ ہے کہ تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو؟ کیا تم سمجھتے نہیں۔ اور مدد چاہو صبر اور نماز[۵۴] سے اور بے شک یہ بھاری چیز ہے مگر ان لوگوں کے لئے جو ڈرنے والے ہیں۔ جو گمان رکھتے ہیں کہ انہیں اپنے رب سے ملنا ہے اور وہ اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ ۴۶

---

۵۱ یعنی قرآن اس پیشین گوئی کی تصدیق کرتا ہے جو تورات میں آخری نبیؐ کی بعثت اور اس کی خصوصیات سے متعلق وارد تھی۔ اب تک یہ پیشین گوئی اپنے حقیقی مصداق کے ظہور کی منتظر تھی۔

۵۲ یہود نے حق پر پردہ ڈالنے کے لئے تورات میں ہر قسم کے تحریفات کر ڈالے تھے۔ ان تحریفات سے مقصود ان حقائق پر پردہ ڈالنا تھا جو آخری نبیؐ کی بعثت کی نشان دہی کرنے والے تھے۔

۵۳ اس آیت میں یہود کو عہدِ الٰہی کے بنیادی احکام از سر نو زندہ کرنے کی ہدایت کی ہے انہوں نے نماز کا حکم سرے سے ختم کر دیا تھا۔ زکوٰۃ کا مستحق فقرا و مساکین کے بجائے اپنے کاہنوں کو سمجھ لیا تھا اور نماز میں غربا و عوام کے ساتھ پہلو بہ پہلو کھڑے ہونے کو کسرِ شان سمجھتے تھے۔ یہاں نماز با جماعت پر خاص طور پر زور دیا ہے۔

۵۴ مذکورہ ہدایات و تنبیہات کے بعد وہ طریقہ بتایا ہے جسے اختیار کر کے بنی اسرائیل آخری نبیؐ پر ایمان لانے کے مشکل کام کو آسان بنا سکتے تھے۔ وہ طریقہ صبر اور نماز کا طریقہ ہے صبر کے معنی نفس کو گھبراہٹ، مایوسی اور دل برداشتگی سے بچا کر اپنے موقف پر جمائے رکھنے کے ہیں۔ صحیح موقف پر ڈٹے رہنے کی یہ خصلت ریاضت سے پیدا ہوتی ہے۔ جس کا طریقہ نماز ہے۔

اے بنی اسرائیل، میری اس نعمت کو یاد کرو جو میں نے تم پر کی اور اس بات کو کہ میں نے تمہیں دنیا والوں پر فضیلت[۵۵] دی۔ اور اس دن سے ڈرو جس دن کوئی جان کسی دوسری جان کے کچھ کام نہ آئے گی۔ نہ اس کی طرف سے کوئی سفارش قبول ہوگی اور نہ اس سے کوئی معاوضہ لیا جائے گا اور نہ ان کی کوئی مدد کی جائے گی[۵۶]۔ ۴۸

اور یاد[۵۷] کرو جب کہ ہم نے تم کو آلِ فرعون[۵۸] کے قبضہ سے چھڑایا۔ وہ تمہیں برے عذاب چکھاتے تھے۔ تمہارے بیٹوں کو ذبح کرتے اور تمہاری عورتوں کو زندہ رکھتے اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے بڑی بھاری آزمائش تھی۔ ۴۹

اور یاد کرو جب کہ ہم نے دریا کو پھاڑ کر تمہیں پار کرایا پس تمہیں نجات دی اور آلِ فرعون کو غرق کر دیا اور تم دیکھتے رہے۔ ۵۰

---

۵۵ فضیلت سے مراد قوموں کی ہدایت و راہنمائی کا وہ منصب ہے جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ایک خاص دور میں منتخب فرمایا۔ یہاں یہود کو یاد دلایا ہے کہ یہ فضیلت و بزرگی تمہیں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے حاصل ہوئی۔ اس میں نہ تمہارے استحقاق کو کوئی دخل ہے، نہ تمہارے خاندانی شرف کو۔ اس کو باقی رکھنا چاہتے ہو تو اس کی ذمہ داریوں کو ادا کرو۔

۵۶ یعنی بزرگوں کی نسبت اور سفارش جیسی آرزوؤں پر اعتماد نہ کرو۔ اس دن نہ کوئی شفاعت کرنے والا ہوگا نہ کوئی شفاعت قبول ہوگی، نہ کسی کے پاس دینے کو کچھ ہوگا نہ کسی سے معاوضہ لیا جائیگا۔ نہ کسی کے حامی و مددگار ہوں گے نہ کسی کی حمایت کی جا سکے گی۔ (شعرا ۱۰۰)

۵۷ آگے یہود کی تاریخ کے بعض واقعات کا حوالہ یہ حقیقت واضح کرنے کے لئے ہے کہ تمہاری ناشکری کے باوجود اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے تم پر انعامات کئے۔ ان کا باعث تمہارا تقدس و تقرب نہ تھا۔ اسی لئے ذمہ داریوں کی ادائیگی میں تمہاری کوتاہیوں پر تمہیں مار بھی پڑتی رہی ہے۔ خدا کے ہاں شرف و تقرب ایمان اور عمل صالح کی بنا پر حاصل ہوتا ہے۔

۵۸ یعنی قوم فرعون۔ آل کا لفظ، قوم اور قبیلہ اور اتباع و انصار سب پر حاوی ہے۔

اور یاد کرو جب کہ ہم نے موسیٰ سے چالیس راتوں کا وعدہ ٹھہرایا[۴۹] ۵۱ پھر تم نے اس کے بعد بچھڑے کو معبود بنا لیا اور تم ظلم کرنے والے ہو۔ پھر ہم نے تم سے درگزر کیا اس کے بعد تاکہ تم شکرگزار بنو ۵۲

اور یاد کرو جب کہ ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور فرقان[۵۰] تاکہ تم ہدایت حاصل کرو ۵۳

اور یاد کرو جب کہ موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم کے لوگو، تم نے بچھڑے کو معبود بنا کر اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے تو اپنے پیدا کرنے والے کی طرف رجوع کرو اور اپنے مجرموں کو اپنے ہاتھ سے قتل کرو۔ یہ تمہارے لئے تمہارے پیدا کرنے والے کے نزدیک بہتر ہے۔[۵۱] تو اس نے تمہاری توبہ قبول فرمائی بے شک وہی توبہ قبول کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے ۵۴

اور یاد کرو جب کہ تم نے کہا کہ اے موسیٰ، ہم تمہارا یقین کرنے والے نہیں ہیں جب تک ہم خدا کو کھلم کھلا نہ دیکھ لیں[۵۲]۔ تو تم کو کڑک نے آ دبوچا اور تم دیکھتے رہ گئے ۵۵ پھر ہم نے

---

[۴۹] موسیٰ سے یہ وعدہ اللہ تعالیٰ نے اپنے احکام و ہدایات دینے کے لئے فرمایا اور اس مقصد کے لئے ان کو چالیس روز کے لئے کوہ طور پر بلایا۔

[۵۰] فرقان یعنی حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والی چیز، یہاں مراد تورات ہے۔

[۵۱] گوسالہ پرستی کے واقعہ کے بعد حضرت موسیٰؑ نے ہر قبیلہ کے موحدین اس کام پر مامور کئے کہ وہ اپنے اپنے مرتدوں کی گردنیں ماریں تاکہ یہ اہل ایمان کے مزید ایمان کی ایک شہادت ہو۔ یہ اجتماعی توبہ کی ایک شکل تھی گویا اجتماعی جرم کا کفارہ پورے معاشرہ نے ادا کیا۔ تورات میں یہ واقعہ خروج باب ۳۲ : ۲۵ - ۳۰ میں بیان ہوا ہے۔

[۵۲] یہ اس موقع کی بات ہے جب گوسالہ پرستی کے حادثہ کے بعد حضرت موسیٰؑ اپنی قوم کے ستر منتخب آدمیوں کو لے کر کوہ طور پر اس لئے گئے ہیں کہ اپنی قوم کے لئے خدا سے معافی مانگیں۔ بنی اسرائیل شک کے ایسے مریض تھے کہ انہیں کسی طرح یہ یقین نہیں آتا تھا کہ فی الواقع اللہ تعالیٰ موسیٰؑ سے کلام کرتا ہے۔ ان کا خدا کو دیکھنے کا مطالبہ شرح صدر کے لئے نہیں تھا بلکہ شک پرستانہ ذہنیت کا ایک مظہر تھا۔

تمہاری موت کے بعد تمہیں اٹھایا[۵۳] تاکہ تم شکرگزار بنو ۵۶ اور تم پر بدلیوں کا سایہ کیا اور تم پر من و سلویٰ[۵۴] اتارے، کھاؤ ان پاکیزہ چیزوں میں سے جو ہم نے تم کو بخشی ہیں۔ اور انہوں نے ہمارا کچھ نہیں بگاڑا بلکہ وہ اپنی ہی جانوں پر ظلم کرتے رہے[۵۵] ۵۷ اور یاد کرو جب کہ ہم نے کہا، داخل ہو جاؤ اس بستی میں[۵۶] پس کھاؤ اس میں سے جہاں سے چاہو فراغت کے ساتھ اور داخل ہو دروازے میں سر جھکائے ہوئے اور دعا کرو کہ اے رب! ہمارے گناہ بخش دے، ہم تمہارے گناہ بخش دیں گے اور اچھی طرح حکم بجا لانے والوں پر ہم مزید فضل کریں گے[۵۷] ۵۸ تو جنہوں نے ظلم کیا انہوں نے بدل دیا اس بات کو جو ان سے کہی گئی تھی دوسری بات سے[۵۸] پس ہم نے ان لوگوں پر جنہوں نے ظلم کیا ان کی نافرمانی کے سبب سے آسمان سے عذاب اتارا ۵۹۔

---

[۵۳] معلوم ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کی تجلی نے سارے پہاڑ میں زلزلہ ڈال دیا اور یہ لوگ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ ان کی اس حالت کو موت سے تعبیر کیا ہے۔ جس سے حقیقی موت بھی مراد ہو سکتی ہے اور بطریق استعارہ بے ہوشی بھی۔

[۵۴] من پالے کے دانے کی طرح کی ایک چیز تھی جس کو آفتاب کی تمازت بڑھنے سے پہلے پہلے جمع کر لینا ممکن ہوتا تھا۔ سلویٰ بٹیروں کی طرح کا پرندہ تھا جس کا شکار آسان تھا۔

[۵۵] بنی اسرائیل نے خدا کی ان نعمتوں کی ناقدری کی اور جو لوگ خدا کی کسی نعمت کی ناقدری کرتے ہیں وہ خدا کا کچھ نہیں بگاڑتے بلکہ اپنا ہی بگاڑتے ہیں۔

[۵۶] بستی سے مراد سرزمین فلسطین کا کوئی شہر ہے جو بنی اسرائیل کے قبضہ میں سب سے پہلے آیا۔

[۵۷] بنی اسرائیل کو حکم دیا گیا کہ اس شہر میں داخل ہوں، اس کی زرخیزی اور شادابی سے پوری آزادی کے ساتھ فائدہ اٹھائیں اور خیمۂ عبادت میں سر جھکائے ہوئے عاجزانہ حاضر ہو کر خدا کا شکر ادا کرتے اور اپنے گناہوں کی معافی مانگتے رہیں۔ بنی اسرائیل نے اس ہدایت کی بھی خلاف ورزی کی۔

[۵۸] دعا کے لئے حِطّۃ کا جو لفظ ان کو تلقین کیا گیا تھا، اس کو انہوں نے بالکل مختلف مفہوم رکھنے والے لفظ سے بدل لیا جس سے دعا کی اصل روح بالکل بدل گئی۔

اور یاد کرو جب کہ موسیٰ نے اپنی قوم کے لئے پانی کی دعا کی تو ہم نے کہا اپنی لٹھیا پتھر پر مارو تو اس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے۔ ہر گروہ نے اپنا اپنا گھاٹ متعین کر لیا[۵۸] کھاؤ اور پیو اللہ کے رزق میں سے اور نہ پھرو زمین میں فساد مچانے والے بن کر[۵۹]"

اور یاد کرو جب کہ تم نے کہا اے موسیٰ ہم ایک ہی قسم کے کھانے پر ہرگز صبر نہیں کر سکتے تو اپنے رب سے ہمارے لئے دعا کرو کہ وہ ہمارے لئے ان چیزوں میں سے نکالے جو زمین اگاتی ہے اپنی سبزیوں، ککڑیوں، لہسن، مسور اور پیاز میں سے، کہا کیا تم اعلیٰ کو ادنیٰ سے بدلنا چاہتے ہو[۶۰] کسی شہر میں اترو تو وہ چیز تمہیں ملے گی جو تم نے طلب کی ہے۔ اور ان پر ذلت اور پست ہمتی تھوپ دی گئی اور وہ خدا کا غضب لے کر لوٹے[۶۱] یہ اس سبب سے کہ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے تھے۔ اور نبیوں کو ناحق قتل کرتے تھے، یہ اس وجہ سے کہ انہوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے بڑھ جانے والے تھے۔"

---

[۵۸] تورات کی کتاب گنتی باب ۲۰ کے مطابق حضرت موسیٰ نے پانی کی دعا دشت صین میں کی۔ بنی اسرائیل کے خاندان بارہ تھے اس وجہ سے ہر خاندان نے اپنے اپنے گھاٹ الگ الگ متعین کر لئے اور اس چیز کا کوئی اندیشہ نہ رہا کہ پانی کے لینے پر کوئی جھگڑا برپا ہو۔

[۵۹] یہ اس عظیم نعمت کا حق بیان ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ہر نعمت زبانِ حال سے ہمیں اس حق کی یاددہانی کرتی ہے جو اس سے بہرہ مند ہونے کے سبب سے ہم پر عائد ہوتا ہے۔

[۶۰] یعنی یہ من وسلویٰ کی غذا تمہیں اس صحرا میں اس حالت میں مل رہی ہے کہ تم فرعونیوں کی غلامی اور شرک وکفر کی اطاعت کی ذلت سے بالکل آزاد ہو۔ یہ تمہاری بدقسمتی ہے کہ تم چٹخاروں کے ایسے رسیا ہو کہ ان کے پیچھے تمہاری نظروں میں اس آزادی کی کوئی قدر وقیمت نہیں ہے۔

[۶۱] جو قوم کسی اعلیٰ نصب العین کے لئے اپنے اندر صبر واستقامت نہیں پیدا کر سکی وہ اپنے آپ کو ذلت سے نہیں بچا سکی۔ بنی اسرائیل کی مسلسل ناشکریوں کے سبب سے ان پر ذلت ومسکنت تھوپ دی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنے دشمنوں کے لئے نہایت ہی نرم چارہ بن کر رہ گئے۔ اور جو موقع ان کی سرخروئی کے لئے فراہم کئے گئے اپنی پست ہمتی کے سبب سے وہاں سے خدا کی لعنت لے کر لوٹے۔

باقی صفحہ ۸ پر ملاحظہ فرمائیں

امین احسن اصلاحی

فہم قرآن کے لئے چند بنیادی اصول

(یہ تقریر ٹیپ سے لی گئی ہے اور ضرورت کے مطابق اس میں کمی بیشی کی گئی ہے۔ قارئین اس کا مطالعہ اس صورت خاص کو ملحوظ رکھتے ہوئے کریں۔ عبداللہ غلام احمد)

جس طرح دین کو سمجھنے کے لئے چند بنیادی حقائق کو ماننا لازمی ہے اسی طرح قرآن مجید کو سمجھنے اور ماننے کے لئے چند بنیادی حقائق یا اصول موضوعہ کو ماننا اور سمجھنا ضروری ہے۔ اگر ان میں سے کسی ایک اصول میں بھی تردد باقی رہا تو وہ قرآن مجید کے سمجھنے پر لازماً اثر انداز ہوگا اور اگر کسی اصول کو آپ نے صحیح طور پر نہیں سمجھا تو جس حد تک آپ نے اسے نہیں سمجھا ہے اس حد تک وہ آپ کے فہم قرآن پر اثر انداز ہوگا اور اگر آپ ان میں سے کسی کو سرے سے مانتے ہی نہیں تو ہو سکتا ہے کہ آپ کے لئے فہم قرآن کی راہ یکقلم مسدود ہی ہو جائے۔ ان اصولوں کی حیثیت بنیادی کلیات کی ہے جن کو جانے بغیر چارہ نہیں۔ تاریخ انسانی میں غالباً وہ فیصلہ کن دور اب آگیا ہے جب ان کو سمجھ لینا اور ان کے بارے میں یکسو ہو جانا ضروری ہو گیا ہے۔ اب میں ان اصولوں میں سے ایک ایک پر بقدر ضرورت گفتگو کروں گا۔

۱۔ قرآن مجید کی دعوت عقل وفطرت پر مبنی ہے

سب سے پہلی بات سمجھنے کی یہ ہے کہ قرآن مجید کی تمام دعوت عقل اور فطرت پر مبنی ہے اور اس کی اپیل بھی تمام تر عقل وفطرت ہی سے ہے۔ قرآن مجید ہر جو دعویٰ بھی ہمارے سامنے رکھتا ہے اس کو عقلی وفطری دلائل سے ثابت اور مدلل کرتا ہے۔ جب مخاطب اس کے باوجود اس بات کو نہیں مانتے تو وہ ان کو ملامت کرتا ہے کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم عقل سے کام نہیں لیتے؟ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم سمجھتے نہیں؟

وہ قدم قدم پر مخاطبوں کو یہ احساس دلاتا ہے کہ اس نے یہ انداز اس لئے اختیا

کیا کہ وہ سمجھ سکیں۔ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ (۱۱۸، آل عمران) (ہم نے تمہارے لئے نشانیوں کو کھول دیا ہے، اگر تم عقل سے کام لینے والے ہو) جب ضدی اور ہٹ دھرم مخاطب ان دلائل کو خاطر میں نہیں لاتے تو قرآن اس پر حیرت کے سے انداز میں کہتا ہے۔ اُنْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝ (۷۵، مائدہ) (دیکھو ہم کیسے ان کے لئے دلائل کو واضح کرتے ہیں اور دیکھو یہ کہاں الٹے دیئے جاتے ہیں) قرآن مجید نے عقل سے کام نہ لینے والے انسانوں کو بدترین چوپائے قرار دے کر ان کو سرزنش کی ہے۔ فرمایا اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ۔ ۲۲، انفال (اللہ کے نزدیک بدترین جانور وہ بہرے گونگے لوگ ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے) یہ انداز بیان صاف ظاہر کرتا ہے کہ اس کی اپیل تمام تر عقل سے ہے اور جب لوگ عقل پر پٹی باندھ لیتے ہیں تو وہ ان کے اس رویہ پر ان کو ملامت کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ یہ رویہ انسانی شرف سے مطابقت رکھنے والا نہیں ہے۔

جو شخص بھی قرآن مجید کو غور سے پڑھے گا اس پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ قرآن اپنے دلائل آفاق و انفس سے لیتا ہے۔ چنانچہ فرمایا بھی ہے کہ:

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ

ہم انہیں اپنی نشانیاں دکھاتے رہیں گے، آفاق میں بھی اور ان کے نفسوں میں بھی یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ یہ قرآن بالکل حق ہے۔

(۵۳ ۔ حم السجدۃ)

آفاقی دلائل سے مراد کائنات میں موجود شواہد ہیں مثلاً رات دن کا تسلسل، سورج اور چاند کی گردش، ہواؤں کے تصرفات، پہاڑوں اور سمندروں کے عجائبات، وسائل رزق کا انتظام وغیرہ۔ انفسی دلائل سے مراد انسانی نفسیات اور اس کے اندر ودیعت کردہ حقائق و مسلمات ہیں۔ آفاق و انفس کے دلائل ہی کی روشنی میں قرآن مجید نے خالق کائنات اور اس کی صفات کو بیان کیا ہے، انہی کی روشنی میں اس کائنات کے متعلق جو صحیح تصور انسان کا ہونا چاہیئے اس کو بتایا ہے۔ انہی کی اساس پر اس نے توحید کو ثابت اور شرک کا ابطال

کیا ہے اور یہی وہ دلائل ہیں جن سے اس نے جزا و سزا کو بھی ثابت کیا ہے۔ اس وقت ان دلائل کی تفصیل کا موقع نہیں ہے، محض توجہ دلانے کے لئے چند آیات کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ مثلاً فرمایا ہے۔

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝

(۱۶۴ ۔ بقرہ)

بے شک آسمانوں اور زمین کی خلقت، رات اور دن کی آمد و شد، اور ان کشتیوں میں جو لوگوں کے لئے سمندر میں نفع بخش سامان لے کر چلتی ہیں اور اس پانی میں جو اللہ نے بادلوں سے اتارا اور جس سے زمین کو اس کی موت کے بعد زندگی بخشی اور جس سے اس میں ہر قسم کے جاندار پھیلائے اور ہواؤں کی گردش میں اور ان بادلوں میں جو آسمان و زمین کے درمیان مامور ہیں، ان لوگوں کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں۔

قرآن نے آسمان و زمین دونوں کے توافق اور ہم آہنگی کو بیان کر کے یہ دلیل قائم کی ہے کہ یہ ہرگز ممکن نہیں کہ آسمان کے اندر ایک اور ارادہ کام کر رہا ہو اور زمین پر کوئی دوسرا۔ ان کی کامل ہم آہنگی اس بات کا ثبوت ہے کہ زمین سے آسمان تک ایک ہی ذات کا ارادہ کارفرما ہے۔ ایک نہایت ہی زبردست اور حکیم قوت قاہرہ ہے جو انہیں کنٹرول کئے ہوئے ہے اور اس کارخانے کے ہر گوشہ میں جو عظیم حکمت ہے وہ اس بات کی شہادت ہے کہ یہ بے غایت و بے مقصد نہیں ہو سکتا۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ اس کے لئے ایک یوم الحساب بھی آئے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا فَاَنْۢبَتْنَا بِهِ جَنّٰتٍ وَّحَبَّ الْحَصِيْدِ ۝

اور ہم نے آسمان سے بابرکت پانی برسایا، جس سے ہم نے باغ بھی اگائے اور کاٹی

النَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ ۙ رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ ۙ وَاَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا ۭ كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ ۝

(۱۱ - ق)

جانے والی فصلیں بھی اور کھجور کے بلند و بالا درخت بھی جن میں تہ بہ تہ خوشے لگتے ہیں بندوں کی روزی کے لئے اور ہم نے اس سے مردہ زمین کو زندہ کر دیا۔ اسی طرح مرنے کے بعد زمین سے نکلنا بھی ہوگا۔

یہاں آسمان و زمین کی نشانیوں کی طرف ایک ایسے زاویہ سے توجہ دلائی ہے جس سے آسمان و زمین کے درمیان توافق کے پہلو سے توحید کی شہادت بھی ملتی ہے۔ ان کے اندر ربوبیت کے جو اسباب ودلیعت ہیں ان سے اس دنیا کے بعد آخرت اور اس جزا و سزا کا لزوم بھی سامنے آتا ہے اور بارش سے مردہ زمین کے اندر جو حیات تازہ نمودار ہوتی ہے اس سے حیات بعد الممات کے وقوع کا بھی مشاہدہ ہر شخص کو ہوتا ہے۔

اسی طرح قرآن نے انفس کے دلائل سے جگہ جگہ استشہاد کیا ہے۔ فرمایا:-

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝

(۷ - ۱۰ - الشمس)

شاہد ہے نفس اور جیسا کچھ اس کو سنوارا پس اس کو سمجھ دی اس کی بدی اور نیکی کی۔ کامیاب ہوا جس نے اس کو پاک کیا اور نامراد ہوا جس نے اس کو آلودہ کیا۔

یہاں اس بات پر دلیل قائم کی ہے کہ اپنے آپ کو غیر مسئول اور شتر بے مہار سمجھنے کا تصور انسان کے خود اپنے نفس کی شہادت کے خلاف ہے۔ خالق نے اس کی تشکیل اس طرح فرمائی کہ اس کے اندر نیکی اور بدی دونوں کا شعور ودیعت ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ انسان نیکی کو اختیار کرے اور بدی سے اپنے آپ کو بچائے۔ نیکی اور بدی کا شعور دینے کے بعد یہ بالکل ناممکن ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نیک اور بد دونوں کے ساتھ یکساں معاملہ کرے

قرآن نے انسانی فطرت کے حوالہ سے اس سوال کا جواب دیا ہے کہ جب انسان کو نیکی کا علم ہے تو وہ بدی کا ارتکاب کیوں کرتا ہے؟ اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ ایسا وہ اس لئے نہیں کرتا کہ وہ اپنی فطرت کے تقاضے سے بے خبر

ہے بلکہ حقیقت میں وہ شہوات و رغبات کے غلبے کی وجہ سے یہ حرکت کر جاتا ہے۔ ورنہ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ جس برائی کا وہ خود ارتکاب کرتا ہے وہی برائی جب دوسرا اس کے ساتھ کرتا ہے تو وہ سراپا احتجاج بن جاتا ہے۔ یہ مضمون سورۂ تطفیف میں قرآن نے نہایت وضاحت سے بیان کیا ہے۔ تدبر قرآن میں اس کی تفسیر پڑھ لیجئے

سورہ قیامہ میں وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ (نہیں، قسم نفس ملامت گر کی) فرما کر یہ خبر دی ہے کہ انسان خود اپنے ضمیر کے اندر ایک نگران رکھتا ہے جو اس سے صادر ہونے والی برائیوں پر اس کو ٹوکتا رہتا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ انسان دنیا میں شتر بے مہار نہیں ہے بلکہ اس کے لئے پرسش کا دن لازماً آنے والا ہے اس سورۃ کی آیت بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ۙ وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ (۱۴، ۱۵) (بلکہ انسان خود اپنے اوپر گواہ ہے اگرچہ کتنے ہی بہانے پیش کرے) میں بھی اسی حقیقت کو بیان کیا ہے۔

قرآن مجید نے انسانی فطرت ہی کے تقاضوں کی روشنی میں متعدد تمثیلات سے سمجھایا ہے کہ انسانی فطرت شرک کے عقیدہ سے ابا کرتی ہے نیز وہ یہ بھی چاہتی ہے کہ یہ ضروری ہے کہ خالق کائنات نیکوں اور بدوں کے ساتھ ان کے اعمال کے مطابق الگ الگ معاملہ کرے پھر لوگوں کو کیوں اصرار ہے کہ وہ خدا کے شریک ٹھہراتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ خدا کا معاملہ نیکوں اور بدوں کے ساتھ یکساں ہوگا؟ مثلاً فرمایا

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِيْهِ شُرَكَاۗءُ مُتَشٰكِسُوْنَ وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ ۭ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ۭ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝

(۲۹ - زمر)

اللہ تمثیل بیان کرتا ہے ایک غلام کی جس میں کئی مختلف الاغراض آقا شریک ہیں اور ایک دوسرے غلام کی جو پورے کا پورا ایک ہی آقا کی ملک ہے۔ کیا ان دونوں کا حال یکساں ہوگا! سزاوار شکر صرف اللہ ہے۔ لیکن ان کی اکثریت اس حقیقت کو نہیں سمجھتی۔

اس تمثیل میں توحید کی نفسیاتی دلیل ہے۔ فرمایا ہے انسانی فطرت بیک وقت بہت

سے خداؤں کی غلامی پر راضی نہیں ہو سکتی۔ انسان ایک بلند حوصلہ مخلوق ہے۔ وہ کسی کی غلامی پر آسانی سے راضی نہیں ہوتا۔ مشرک کئی دیوتاؤں کی بندگی کی ذلت کو گوارا کرتا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ وہ انسانیت کے شعور اور شرف کے صحیح احساس سے بالکل محروم ہوتا ہے؟ اسی طرح قرآن نے یہ بھی سمجھایا ہے کہ جب تم اپنے لائق اور نالائق غلاموں میں فرق کرتے ہو تو خدا سے متعلق یہ گمان کیوں رکھتے ہو کہ وہ اپنے باغی اور فرمانبردار بندوں کے ساتھ یکساں معاملہ کرے گا۔

اوپر کی اس تفصیل سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن مجید نے انسان کی عقل کو بنیادی اہمیت دے کر اپنی دعوت عقلی دلائل کے زور کے ساتھ پیش کی ہے۔ اس کے دلائل کے ماخذ آفاق اور انفس ہیں۔ وہ فلسفہ تاریخ سے بھی استشہاد کرتا ہے اور تاریخ کے متعلق معلوم ہے کہ وہ آفاق ہی کا ایک حصہ ہے۔

حیرت ہے کہ ان شواہد کے باوجود ہمارے ہاں یہ چیز کس طرح ذہنوں پر مسلط ہو گئی کہ قرآن بس مان لینے کی چیز ہے اس کو عقل سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ امام غزالیؒ جو ایک عقلی آدمی بلکہ عاقلوں کے امام سمجھے جاتے ہیں اپنی کتاب مستصفیٰ میں اصول فقہ کا تعارف کراتے ہوئے بڑی بے تکلفی کے ساتھ لکھتے ہیں کہ "اب تک ہمارا تعلق" جن علوم سے رہا ان کا تعلق تو حافظہ سے تھا لیکن اب ہم جس فن سے تعرض کر رہے ہیں اس کا تعلق عقل سے ہے۔ حافظہ سے تعلق رکھنے والے علوم میں انہوں نے گویا قرآن و حدیث کے علوم کو شامل کیا ہے۔ جبکہ عقل سے تعلق رکھنے والا علم ان کے نزدیک اصول فقہ ہے۔

یہی حال دوسرے متکلمین کا بھی ہے۔ امام رازیؒ بسا اوقات اشاعرہ کے کلامی نظریات کو صحیح ثابت کرنے میں حد درجہ انتہا پسند ہو جاتے ہیں کہ اگر کوئی آیت ان کو صریحاً مسلک اشاعرہ کے خلاف نظر آتی ہے تو اس کی تردید میں یہ کہنے میں بھی ان کو باک نہیں ہوتا کہ ہمارا جو اصول براہینات سے ثابت ہے وہ محض اس بنا پر مجروح نہیں ہو سکتا کہ ایک آیت کے الفاظ جن کی دلالت تمام تر سماع پر مبنی ہے اس کے خلاف ہیں۔ براہینات سے امام رازیؒ کی مراد کلامی دلائل ہوتے ہیں۔

اشاعرہ کا عام مسلک یہ ہے کہ نبی کو ہم نے معجزات کے ذریعہ سے پہچانا اور جب نبی کو مان لیا تو جو کچھ وہ کہتا ہے ہم اس کو مانتے ہیں اس میں عقل کا کیا سوال ہے! اشاعرہ کے اس قول کے برعکس قرآن پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حسی معجزات کی حوصلہ افزائی بالکل نہیں کرتا۔ قریش نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جب جب حسی معجزات کا مطالبہ کیا تو ان کو یہ جواب دیا گیا کہ آفاق پر کیوں غور نہیں کرتے انفس کے دلائل کو کیوں نظر انداز کر رکھا ہے!! عقل سے کام لو۔ معجزات دیکھنے کے باوجود بھی قومیں ماضی میں ایمان نہیں لائیں۔

وَمَا مَنَعَنَا أَنْ نُرْسِلَ بِالْآيَاتِ إِلَّا أَنْ كَذَّبَ بِهَا الْأَوَّلُونَ ۚ

اور ہم کو نشانیاں بھیجنے سے نہیں روکا مگر اس چیز نے کہ اگلوں نے ان کو جھٹلایا۔

(۵۹۔ بنی اسرائیل)

سورۃ انعام آیت ۳۵ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر عتاب فرمایا کہ اگر یہ لوگ معجزات مانگتے ہیں تو ہم تو انہیں معجزات دکھانے کے حق میں نہیں، تم اگر آسمان میں سیڑھی لگا کر یا زمین میں سرنگ کھود کر کوئی نشانی لا سکتے ہو تو لا کر انہیں دکھاؤ۔

میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معجزات دیئے ہی نہیں گئے معجزات آپ نے دکھائے لیکن قرآن مجید کی دعوت کو ماننے کے لئے معجزہ دیکھنے کی شرط کی ہمیشہ حوصلہ شکنی کی گئی۔ شاید ہی کوئی بڑی سورۃ ایسی ہو جس میں حسی معجزات کی شرط لگانے والوں کو اندھے اور بے بصیرت نہ کہا گیا ہو۔ اگر واقعی دین کی بنیاد معجزات پر ہوتی تو چاہئے یہ تھا کہ سب سے پہلے اسی بنیاد کو ثابت کیا جاتا لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ بلکہ قرآن مجید نے سابق انبیاء کے ان دلائل اور حجتوں کو بڑے زور سے بیان کیا ہے جو تمام تر عقلی اور عقلی استدلال اور عقلی حجت پر قائم ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ ہماری عقلی غذا معجزات نہیں بلکہ عقلی دلائل ہیں۔ معجزات صرف اتمام حجت اور قطع عذر کے لئے دکھائے گئے ہیں جب خدا نے ایسا چاہا ہے۔

اشاعرہ کے فلسفہ سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ انسان کو ایک مادر زاد اندھے کی طرح فرض کرتے ہیں جو ایک عصاکش کا محتاج ہوتا ہے۔ کوئی اس کی لٹھیا پکڑ کے چلائے تو اس کے پیچھے پیچھے وہ چلتا ہے۔ اس کے برعکس قرآن مجید کا یہ دعویٰ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت اور

عقل کے اندر ایک نور رکھا ہے۔ وہی نور انسان کا اصل جوہر ہے۔ اسی سے انسان انسان بنتا ہے ورنہ انسان اور جانور میں اصلاً کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ صرف شکل و صورت ہی کا فرق رہ جاتا ہے۔ انسان کا اصلی جوہر اور اصلی کمال یہی نور ہے۔ اس کے اوپر اس کے تمام عروج اور تمام سعادت کا انحصار ہے۔ فطرت اور عقل کا یہی نور ہے جس کو قرآن نے "بینہ" سے تعبیر کیا ہے اور جس کا درجہ یہ ہے کہ جب اس پر وحی کے نور کا اضافہ ہو جاتا ہے تو انسان کا باطن "نور علیٰ نور" ہو جاتا ہے۔ یہ مقام خاص انبیائے کرام کو حاصل ہوتا ہے۔

قرآن مجید کے اس دعویٰ کی روشنی میں دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ عقل کے بارے میں نہ تو تشکیک میں مبتلا فلسفیوں کی رائے درست ہے نہ عقل پر کلی اعتماد کرنے والوں کی۔ اہل تشکیک کے نزدیک تو عقل گویا محض دھوکہ دینے کے لئے ہے۔ ان کو اپنے حواس، مشاہدہ اور اپنے عقلی ادراکات میں سے کسی چیز پر بھی اعتماد نہیں۔ اسی طرح قرآن ان لوگوں کے دعوے کو بھی تسلیم نہیں کرتا جو کہتے ہیں کہ عقل ہماری رہنمائی کے لئے کافی ہے، ہم کسی اور چیز کے محتاج نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ عقل ٹھوکر بھی کھا جاتی ہے، یہ نفس کی رشوت بھی قبول کر لیتی ہے، اسے مرعوب بھی کیا جا سکتا ہے، یہ متزلزل بھی ہو جاتی ہے اور دھوکے میں بھی آ جاتی ہے۔

ہمارے نزدیک یہ دونوں ہی حق سے دور ہیں۔ جن لوگوں نے عقل کو بالکل ہی مطعون کر دیا ان لوگوں نے تو گویا اپنے اندر کے اصل چراغ ہی کو گل کر دیا۔ جن لوگوں نے عقل کو کافی سمجھ لیا انہوں نے عقل کے اوپر اس سے زیادہ اعتماد کر لیا جتنا اعتماد اس پر کرنا چاہیے۔ یہ دونوں راستے غلط ہیں۔ صحیح راستہ قرآن نے بتایا ہے کہ انسان کا نور اس کی فطرت اور عقل کی صورت میں اس کے پاس ہوتا ہے۔ اس نور کے اوپر وحی کا نور آ کر انسان کو بالکل جگمگا دیتا ہے۔ اس کے بعد عقل اگر وحی کی روشنی میں چلے گی تو کبھی ٹھوکر نہیں کھائے گی۔ اگر کبھی ٹھوکر کھائے گی بھی تو امید ہے کہ جلد متنبہ ہو کر سلامتی کے راستے پر لوٹ آئے گی۔

پس قرآن مجید کو پڑھتے وقت یہ بات پیش نظر ہونی چاہیئے کہ یہ ہماری فطرت اور عقل کا بیان ہے۔ لہٰذا اس میں جو کچھ ہے وہ انسانی فطرت اور عقل کے مطابق ہے۔ اگر قرآن مجید کے بیان اور فطرت میں بظاہر تصادم معلوم ہوتا ہو تو وہاں ہمیں رک کر غور کرنا ہوگا کہ یہ تصادم

خالد مسعود

حدیث قتال

عن ابی ھریرۃ قال لما توفی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واستخلف ابوبکر بعدہ وکفر من کفر من العرب قال عمر بن الخطاب لابی بکر کیف تقاتل الناس وقد قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امرت ان اقاتل الناس حتی یقولوا لا الہ الا اللہ فمن قال لا الہ الا اللہ فقد عصم منی مالہ ونفسہ الا بحقہ وحسابہ علی اللہ فقال ابوبکر واللہ لاقاتلن من فرق بین الصلوۃ والزکوۃ فان الزکوۃ حق المال واللہ لو منعونی عقالا کانوا یؤدونہ الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لقاتلتھم علی منعہ فقال عمر بن الخطاب فواللہ ما ھو الا ان رایت اللہ عزوجل قد شرح صدر ابی بکر للقتال فعرفت انہ الحق۔

(صحیح مسلم، باب الامر بقتال الناس)

ترجمہ: "ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی اور آپ کے بعد ابوبکرؓ خلیفہ بنائے گئے اور بعض عربوں نے کفر اختیار کر لیا تو عمر بن خطابؓ نے ابوبکرؓ سے پوچھا کہ آپ لوگوں سے کس بنا پر جنگ کریں گے۔ جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما چکے ہیں کہ مجھے لوگوں سے اس وقت تک جنگ کرنے کا حکم دیا گیا ہے جب تک کہ وہ لا الہ الا اللہ کا اقرار نہ کر لیں پس جو شخص لا الہ الا اللہ کا اقرار کرے گا تو اس کا جان و مال مجھ سے محفوظ ہو گئے بجز اس کو کے کسی حق کی خاطر۔ اور اس شخص کا حساب اللہ کے ذمہ ہے۔ اس پر ابوبکرؓ نے جواب دیا۔ اللہ کی قسم میں ہر اس شخص سے جنگ کروں گا جو نماز اور زکوٰۃ کے درمیان تفریق کرے گا کیونکہ زکوٰۃ مال کا حق ہے۔ اللہ کی قسم! یہ لوگ اگر اونٹ کا گھٹنا باندھنے کی ایک رسی بھی جو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیتے رہے مجھ سے روکیں گے تو میں اس کے روکنے پر ان سے جنگ کروں گا۔ عمر بن خطابؓ کہتے تھے اللہ کی قسم! اسی بات کو دیکھ کر کہ اللہ عزوجل نے ابوبکرؓ کو جنگ کے معاملہ میں شرح صدر عطا کر دیا ہے میں نے بھی سمجھا کہ جنگ کرنا ہی حق ہے۔"

حضرت ابوہریرہؓ کی یہ روایت جس میں ایک حدیث نبوی کی توجیہہ پر دو گرامی قدر صحابہ کی بحث کا ذکر کیا گیا ہے صحاح کی تمام اہم کتابوں میں بیان ہوئی ہے۔ یہ بحث حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے زمانہ میں اس وقت ہوئی جب عرب میں سیاسی خلفشار پیدا ہوا، جیسا کہ روایت کے الفاظ "کفر من کفر من العرب" سے واضح ہو رہا ہے۔ اس خلفشار میں بہت سے وہ لوگ مرتد ہو گئے جو اسلام کے سیاسی غلبہ کے نتیجے میں مصلحتاً مسلمان ہو گئے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد انہوں نے سمجھا کہ ان کی مجبوری اب ختم ہو گئی۔ بعض لوگوں نے یہ سمجھا کہ اب نبوت کا خلا واقع ہو گیا ہے۔ اگر وہ نبی ہونے کا دعویٰ کر دیں تو یہ دعویٰ انہیں سیاسی جمعیت اور اقتدار سے ہمکنار کر دے گا۔ ان کے ایسا دعویٰ کرنے کے بعد ان کے ہمنواؤں نے اسلامی حکومت سے ٹکر لی۔ تیسرا طبقہ ایسا بھی تھا جو اپنی شرائط پر اسلام میں رہنا چاہتا تھا۔ یہ لوگ نماز کا فریضہ ادا کرنے کو تیار تھے لیکن زکوٰۃ کو وبال جان سمجھتے تھے اور اس سے جان چھڑانے کے خواہاں تھے۔

روایت کے دوسرے طرق

مذکورہ صدر روایت کو امام بخاریؒ نے کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ کے باب الاقتداء بسنن رسول اللہ ﷺ میں انہی الفاظ میں لیا ہے جو اوپر بیان ہوئے لیکن کتاب استتابۃ المرتدین والمعاندین اور باب وجوب الزکوٰۃ میں انہوں نے جو روایت لی ہے اس میں لفظ "عِقَالاً" (اونٹ کا گھٹنا باندھنے کی رسی) کے بجائے "عَنَاقاً" (بکری کی میمنی) آیا ہے اور اس کی مناسبت سے مؤنث ضمیریں استعمال ہوئی ہیں باقی مضمون میں کوئی اہم فرق نہیں۔

امام مسلمؒ حضرات شیخینؓ کی بحث سے مجرد کر کے بھی اصل حدیث کو باب الامر بقتال الناس میں لائے ہیں۔ واسطوں کے اختلاف کے باعث حدیث کے الفاظ میں جو فرق واقع ہو گیا ہے وہ ملاحظہ ہو:

ابوہریرہؓ کی ایک روایت جو سعید بن المسیبؒ کے واسطے سے آئی ہے، اس کے الفاظ تو وہی ہیں جو اوپر مذکور ہوئے لیکن ان کی دوسری روایت عبدالرحمٰن بن یعقوبؒ کے واسطے سے ہے، جس کے الفاظ حسب ذیل ہیں:

عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال اقاتل الناس حتی یشھدوا ان لا الہ الا اللہ ویؤمنوا بی وبما جئت بہ فاذا فعلوا ذلک عصموا منی دماءھم واموالھم الا بحقھا وحسابھم علی اللہ (میں لوگوں سے جنگ کرتا رہوں گا یہاں تک کہ وہ گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور ایمان لائیں مجھ پر اور اس پر جو میں

لے کر آیا۔ جب وہ ایسا کریں تو وہ اپنے جان و مال کو مجھ سے محفوظ کر لیں گے بجز اسی کلمہ کے کسی حق کے لئے اور ان کا حساب اللہ کے ذمہ ہو گا)

جابرؓ کی روایت کے الفاظ مذکورہ صدر حدیث کے مطابق ہیں۔ صرف "من قال" کے بجائے "فاذا قالوا" کے الفاظ آنے کے باعث جمع کی ضمیریں استعمال ہوئی ہیں۔

عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ان الفاظ میں ہے: امرت ان اقاتل الناس حتی یشھدوا ان لا الہ الا اللہ وان محمدا رسول اللہ ویقیموا الصلوٰۃ ویؤتوا الزکوٰۃ فاذا فعلوا عصموا منی دماءھم واموالھم الا بحقھا وحسابھم علی اللہ۔ (مجھے لوگوں سے جنگ کرنے کا حکم دیا گیا تا آنکہ وہ گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ جب وہ ایسا کریں تو وہ اپنے جان و مال کو مجھ سے بچا لیں گے بجز اسی کلمہ کے حق کے لئے اور ان کا حساب اللہ کے ذمہ ہے)

مالک کی روایت ہے: قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول من قال لا الہ الا اللہ وکفر بما یعبد من دون اللہ حرم مالہ ودمہ وحسابہ علی اللہ (میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ جس شخص نے لا الہ الا اللہ کہا اور اللہ کے سوا جن کی عبادت کی جاتی ہے ان کا انکار کیا اس کے مال و جان محترم ہو گئے اور اس کا حساب اللہ کے ذمہ ہے)

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ چار مختلف صحابہ جن کی روایت امام مسلم تک پہنچی ہے کلمہ لا الہ الا اللہ کا اقرار نہ کرنے والوں کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارادۂ قتال، اور اس کے اقرار کے بعد لوگوں کے جان و مال کی حفاظت کی ضمانت اور ان کی نیتوں کے حساب کے خدا کے ذمہ ہونے کے مضامین پر متفق ہیں۔ اس طرح روایت کے مختلف طرق سے اس کی صحت کا یقین حاصل ہوتا ہے۔ ان روایات میں جو معمولی فرق واقع ہوا ہے وہ اس لئے ہے کہ بعض صحابہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اصل الفاظ نہیں دہرائے بلکہ روایت بالمعنیٰ کی ہے۔

عبداللہ بن عمرؓ نے جن الفاظ میں روایت کی ہے اگر وہ الفاظ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فی الواقع استعمال کئے ہوتے تو وہ بحث نہ پیدا ہوتی جو مانعین زکوٰۃ کے ساتھ جہاد کے وقت پیدا ہوئی۔ اس صورت میں نہ حضرت عمرؓ کے لئے کسی اعتراض کی گنجائش ہوتی اور نہ حضرت ابوبکرؓ کو انہیں قائل کرنے کے لئے دلائل دینے

پڑتے۔ اس نے عبداللہ بن عمرؓ کی روایت میں یقیموا الصلوٰۃ ویوتوا الزکوٰۃ کی تفصیل سے اگرچہ مضمون کی تکمیل ہوگئی ہے اور اس میں کوئی خلا باقی نہیں رہا۔ تاہم معلوم ہوتا ہے کہ یہ الفاظ اصل حدیث میں نہ تھے۔ ان کا اضافہ روایت کے بالمعنی ہونے کے باعث ہوا ہے۔

وضاحت حدیث حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کی بحث سے مجرد حدیث کے الفاظ کا مفہوم بالکل صاف ہے۔ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ مجھے لوگوں سے جنگ کرنے کا حکم ہے۔ یہ جنگ اس وقت تک جاری رہے گی جب تک وہ لوگ لا الٰہ الا اللہ کا اقرار نہیں کر لیتے۔ اگر وہ یہ اقرار کر لیں تو میں ان کے جان و مال کی حفاظت کا ضامن بن جاؤں گا تا آنکہ وہ خود کوئی ایسی حرکت نہ کریں کہ ان کے جان و مال اسی کلمہ لا الٰہ الا اللہ ہی کے تحت مطلوب ہوں۔ لوگوں کا یہ اقرار نیک نیتی پر مبنی ہوتا ہے یا بدنیتی پر؟ اسے دیکھنا میرے دائرہ کار میں نہیں ہے۔ میں ان کے ظاہری اقرار کی بنیاد پر معاملہ کروں گا اور ان کی نیتوں کا حساب اللہ کے ذمہ ہوگا۔

"لوگوں سے جنگ" کے الفاظ اگرچہ عام ہیں لیکن معلوم ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کوئی قدم نہیں اٹھایا جس سے لوگوں کو تلوار کے زور سے مسلمان بنانے کی سعی کی گئی ہو۔ آپ نے طویل عرصہ تک تبلیغ دین فرمائی اور اس میں آپ کو ظلم و ستم بھی سہنے پڑے۔ ہجرت کے بعد یہود سے معاہدات کئے گئے جن کی رو سے اسلامی حکومت ان کی دست و بازو تھی۔ بعض علاقوں کے اہل کتاب سے جزیہ قبول کیا گیا۔ آپ کو متعدد جنگیں لڑنی پڑیں لیکن یہ بیشتر مدینہ کے قرب و جوار میں پیش آئیں۔ ان کا سبب آپ نہیں بنے بلکہ ان میں قریش پیش پیش نظر آتے ہیں۔ اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ جنگ سے کوئی خاص معنی مراد ہیں۔

جب ہم مضمونِ قتال کی بابت قرآن مجید کے احکام کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس میں ایک تدریج نظر آتی ہے۔ ہجرتِ مدینہ تک مسلمانوں کو کسی بھی جنگی کارروائی سے روکا گیا تھا۔ ہجرت کے بعد آغاز میں صرف ان کارروائیوں میں حصہ لینے کی اجازت دی گئی جو بالکل ناگزیر ہو جائیں۔ فتح مکہ کے بعد ایک مرحلہ آیا جب مسلمانوں کو مشرکین سے قتال عام کا حکم ہوا۔ اس کا اعلان نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ۹ھ کے حج کے اجتماع میں دلوایا تاکہ پورے عرب کے قبائل اس کو سن لیں اور اس دار و گیر سے عام طور پر واقف ہو جائیں جو چند ماہ بعد ہونے والی تھی۔ پھر یا تو شرک سے تائب ہو کر ایمان لے آئیں یا جنگ کا لقمہ بننے کو تیار رہیں۔ اسلام قبول کرنے کی علامت اقامتِ صلوٰۃ اور ادائے زکوٰۃ کو قرار دیا گیا۔ قرآن مجید میں یہ حکم ان الفاظ میں دیا گیا:

فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ۚ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۵۔ توبہ)

پھر جب محترم مہینے گزر جائیں تو مشرکین کو قتل کرو جہاں ان کو پاؤ۔ ان کو پکڑو، ان کو گھیرو اور ان کے لئے ہر گھات میں بیٹھو۔ تب اگر وہ توبہ کریں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو ان کا راستہ چھوڑ دو بے شک اللہ غفور رحیم ہے۔

اس حدیث کے الفاظ میں "لوگوں" سے مراد یہی مشرکین بنی اسماعیل ہیں اور "جنگ" سے مراد وہ دار و گیر ہے جس کا اعلان ۹ھ کے حج میں ہوا۔ اس بات کی شہادت کہ حضور کا یہ ارشاد اسی موقع کا ہے اس بات سے بھی ملتی ہے کہ ابو ہریرہؓ اس کے راویوں میں ہیں جو ۷ھ میں اسلام لائے۔

ممکن ہے کہ کسی کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہو کہ اس مرحلہ میں مشرکین کے ساتھ قتال کی ضرورت کیوں پیش آئی تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ رسولوں کو ان قوموں کے لئے فیصلہ کن داعی بنا کر بھیجتا رہا ہے جو ان کی مخاطب تھیں۔ جب انہوں نے قوم پر اتمام حجت کر دیا تو نافرمانی کی صورت میں یا تو قوم پر عذاب بھیجا گیا جس سے وہ ہلاک ہو گئی یا اسے مومنین کے ہاتھوں تباہ کر دیا گیا۔ اس سنت اللہ کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک طویل مدت تک قریش کو، جو پورے عرب کے سرخیل تھے دین کی تبلیغ کی۔ ایمان لانے کے بجائے انہوں نے آپ کو ہجرت پر مجبور کر دیا۔ آپ نے مدینہ کو مرکز دعوت بنایا تو وہ آپ کو وہاں سے بھی اکھاڑنے کے درپے ہو گئے۔ متعدد جنگوں کے بعد آپ نے مکہ فتح کر لیا تو قریش عام طور پر ایمان لے آئے۔ اس سے دوسرے عرب قبائل کے قبول اسلام کی راہ ہموار ہو گئی۔ مسلمانوں کی اس کامیابی کے بعد کسی مشرک کے لئے اس بات کا جواز باقی نہ رہا کہ وہ اپنے آبائی دین پر اڑا رہے۔ چنانچہ خاصی مدت گزرنے کے باوجود جو لوگ اپنی ضد پر قائم رہے ان سے نمٹنے کے لئے آنحضرتؐ کو یہ ہدایت دی گئی کہ ان کی سرکوبی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا جائے کیونکہ رسول کی بعثت اور اتمام حجت کے بعد اس کے مخاطبوں کو شرک پر قائم رہنے دینا اللہ تعالیٰ کی سنت کے خلاف ہے۔

اب حدیث کا مفہوم متعین کیجئے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دار و گیر کے اسی

حکم کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا کہ میں برابر مشرکین بنی اسماعیل سے جنگ کرتا رہوں گا تاآنکہ یہ اپنے موقف سے توبہ کرکے لا الٰہ الا اللہ کا اقرار کرلیں۔ اس اقرار میں ظاہر ہے کہ اس کلمہ کے تقاضے از خود شامل ہیں جن میں نماز اور زکوٰۃ سرفہرست ہیں اور سورۃ توبہ کی آیت ۵ میں ان کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ جو لوگ نبی صلعم پر ایمان لانے والے بنے ان کے لئے حضورؐ نے یہ ضمانت دی کہ اسلامی حکومت ان کو شہریت کے تمام حقوق دے گی اور ان کی جان و مال کی حفاظت کرے گی الا یہ کہ وہ خود ہی اس کلمہ کے کسی تقاضا کی خلاف ورزی کرکے اپنے جان و مال کو خطرے میں نہ ڈال لیں۔ اس میں اشارہ ہے ان حدود کی طرف جو اسلام نے رائج کیں اور بعض جرائم کی سزا میں قتل، پھانسی، جلاوطنی وغیرہ کی بھی گنجائش رکھی۔ جو شخص اپنی ظاہری زندگی میں مذکورہ تبدیلی پیدا کرلیتا وہ امت مسلمہ کا فرد بن جاتا اور شہری حقوق اسے حاصل ہو جاتے۔ رہا اس کی نیت کا معاملہ کہ اس نے اسلام کا ظاہری لبادہ اوڑھا یا واقعی ایمان اس کے دل میں راسخ ہو گیا تو اس کے بارے میں حضورؐ نے واضح فرما دیا کہ نیتوں کا حساب اللہ کے ہاں ہوگا۔ میری ذمہ داری اسی دنیا کی حد تک ہے۔

حضرات شیخینؓ کی بحث

جب حضرت ابوبکرؓ نے فتنہ جوؤں کے خلاف سخت رویہ اختیار کیا اور مختلف اطراف میں پے درپے جنگی مہمات کا آغاز کیا تو انہوں نے مانعین زکوٰۃ کے خلاف بھی اقدام کا فیصلہ فرمایا۔ اس پر حضرت عمرؓ نے ان سے کہا کیف تقاتل الناس کہ ایسے لوگوں سے آپ جنگ کس بناء پر کریں گے وہ اسلام سے مرتد نہیں ہوئے۔ وہ کلمہ گو ہیں اور ایسے لوگوں کو رسول اللہ ؐ ان کے جان و مال کی حفاظت کی ضمانت دے چکے۔ ان سے برسرپیکار ہو جانے کا کیا جواز ہے؟ حضرت ابوبکرؓ نے اس سوال کا جو جواب دیا وہ ظاہر ہے اس قدر مدلل اور با تفصیل رہا ہوگا کہ اس نے حضرت عمرؓ جیسے زیرک اور مزاج شناس وحی کو قائل کر دیا لیکن روایت میں اس کے صرف تین جملے بیان ہوئے ہیں۔ البتہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جواب کے تین پہلو تھے ایک یہ کہ نماز اور زکوٰۃ میں تفریق نہیں کی جاسکتی، دوسرا یہ کہ زکوٰۃ کلمہ لا الٰہ الا اللہ ہی کے تحت مال کا حق ہے لہٰذا اس سے انکار کرنے والے کے لئے جان و مال کی حفاظت کی ضمانت ختم ہو جائے گی۔ تیسرا یہ کہ زکوٰۃ کی وصولی کی سنت رسول اللہ ؐ نے قائم کی ہے جس کو بدلنے پر میں قادر نہیں۔ سیدنا ابوبکرؓ کا یہ جواب قدرے تفصیل چاہتا ہے جو حسب ذیل ہے:

پورے قرآن مجید میں دین اسلام کی تعبیر کا جو مختصر اور جامع اسلوب اختیار کیا گیا ہے اس میں بیسیوں جگہ نماز اور زکوٰۃ کا حکم اکٹھے آیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں بنیادی نیکیوں کی حیثیت انہی دو کو

حاصل ہے۔ باقی نیکیاں انہی سے پیدا ہوتی ہیں نماز انسان کو خدا سے صحیح طور پر جوڑ دیتی ہے اور زکوٰۃ سے خلق کے ساتھ اس کا تعلق بالکل صحیح بنیاد پر استوار ہو جاتا ہے۔ نماز اور زکوٰۃ پر تمام دین و شریعت کا مدار ہونا صرف قرآن ہی سے واضح نہیں بلکہ تورات، انجیل اور دوسرے صحیفوں میں بھی ان کی یہی حیثیت ہے۔ قرآن مجید میں جہاں صحابہ کرامؓ کو یہ خبر دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو ملک میں اقتدار بخشے گا وہاں حکومت کے فرائض میں اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کو سرفہرست رکھا گیا ہے۔ فرمایا

الَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ	وہ لوگ کہ ان کو اگر ہم ملک میں اقتدار بخشیں
اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ	تو وہ نماز قائم کریں گے اور زکوٰۃ
(۴۱-حج)	ادا کریں گے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ نماز اور زکوٰۃ اسلامی نظام کے وہ دو بنیادی اجزاء ہیں جن کے نفاذ پر ایک اسلامی حکومت مامور ہے ان میں سے کسی کی اہمیت گھٹائی نہیں جاسکتی۔ ان میں سے کسی ایک کو نظرانداز کرنا دین میں وہ رخنہ پیدا کرتا ہے جس کے بعد دین کی عمارت قائم نہیں رہ سکتی۔ سیدنا ابوبکرؓ نے اسی پس منظر میں یہ عزم فرمایا کہ میں نماز اور زکوٰۃ میں تفریق کرنے پر ہرگز تیار نہیں اور مانعین زکوٰۃ کو اس بناء پر کوئی الاؤنس دینے کو تیار نہیں کہ وہ نماز پڑھنے پر تیار ہیں اور اسلام کی حمایت کا دم بھرتے ہیں۔

حضرت ابوبکرؓ کے جواب کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ کلمہ لا الٰہ الا اللہ میں توحید کا جو اقرار کیا جاتا ہے اس کے بعض واجبات اور تقاضے بھی ہیں۔ اس کے تحت نماز اللہ تعالیٰ کا پہلا حق ہے۔ اس کا دوسرا حق زکوٰۃ ہے جو اس نے مال میں عائد کیا ہے۔ اسلامی حکومت زکوٰۃ کی وصولی اللہ کے مقرر کئے ہوئے حق کی حیثیت سے کرتی ہے یہ اس کا اپنا عائد کردہ ٹیکس نہیں ہے جسے وہ اپنی صوابدید پر ختم کر سکے۔ لہٰذا اگر لوگ لا الٰہ الا اللہ کے اس تقاضے کو پورا نہیں کریں گے تو ان کے لئے حکومت کی وہ امان ختم ہو جائے گی جس کی ضمانت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دی تھی۔

سیدنا ابوبکرؓ کے اس جواب کو سمجھنے کے لئے یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ خلفائے راشدین کی حکومت رسول اللہؐ کی رسالت کا تکملہ و تتمہ تھی۔ اس لئے آنحضرتؐ کے نا تمام کاموں کی تکمیل اور دین کا نفاذ اس کی ذمہ داری میں شامل تھا۔ مشرکین کے لئے دارو گیر کے مذکورہ حکم کو اس کے منطقی انجام تک پہنچانا خلیفۂ رسول کا فرض منصبی تھا۔ چنانچہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی پالیسی اس عزم کی آئینہ دار تھی کہ آپ آنحضرتؐ کے مشن کی تکمیل چاہتے تھے۔ اس لئے آپ نے فرمایا کہ رسول اللہؐ کی دی ہوئی ضمانت مال کا حق حکومت کو ادا کرنے پر ختم ہو جائے گی۔

سیدنا ابوبکرؓ کے جواب کا تیسرا پہلو یہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی ذمہ داری کی حدود کا پورا پورا خیال رکھا اور اسلام لانے والوں کو ایسی مراعات نہیں دیں جو انہیں بنیادی فرائض مثلاً ادائگی زکوٰۃ — سے بری الذمہ قرار دیتی ہوں۔ جب حضورؐ نے دین کے نفاذ میں کوئی مداہنت نہیں برتی تو آپ کے کسی جانشین کے لئے یہ کیسے جائز ہو سکتا ہے کہ وہ لوگوں کے جائز مطالبہ پر دینی فرائض میں کتر بیونت کرے۔ اسی لئے آپ نے فرمایا کہ میں رسول اللہ ﷺ کے تکمیل دیئے ہوئے دین کو توڑنے پر تیار نہیں۔ آپ کے خلیفہ کی حیثیت سے مال کا وہ ادنیٰ سے ادنیٰ حصہ یا دوسری روایت کے الفاظ میں بکری کی وہ رسی بھی جو یہ لوگ آپ ﷺ کو دیتے رہے وصول کر کے رہوں گا۔ خواہ مجھے اس کے لئے ان سے جنگ ہی کیوں نہ لڑنی پڑے۔

سیدنا ابوبکرؓ کی وضاحت اس قدر مدلل اور دلنشین تھی اور اس میں اس قدر اعتماد تھا کہ وہ حضرت عمر فاروقؓ کے دل میں اتر گئی اور اس بات کا انہیں بھی یقین کامل ہو گیا کہ لوگوں کی اپنی شرط پر لا الٰہ الا اللہ کا اقرار واقعی بے معنی ہے اور ایسے لوگوں کا شمار ان لوگوں میں ہونا چاہئے جو اسلامی حکومت کا قلادہ اپنی گردن سے نکال کر اس کے مستحق ہو گئے ہیں کہ تلوار ان کا فیصلہ کرے۔

روایت سے امیر کے اختیار پر استدلال اس روایت سے بعض لوگ امیر کے لئے اپنی شوریٰ کی رائے کو مسترد کرنے کے اختیار کا حق ثابت کرتے ہیں۔ جہاں تک اس روایت کے الفاظ کا تعلق ہے ان سے یہ اشارہ تک بھی نہیں نکلتا کہ مانعین زکوٰۃ کے ساتھ جنگ کا مسئلہ کبھی مجلس شوریٰ میں پیش بھی ہوا یا حضرات شیخینؓ کے مابین اس افہام و تفہیم میں کوئی تیسرا شخص بھی شریک تھا۔ مزید براں اس روایت میں کسی ایسے فیصلے کا کوئی حوالہ نہیں جو مجلس شوریٰ نے کیا ہو اور حضرت ابوبکرؓ نے اسے رد کر دیا ہو۔ اس کے برعکس یہ معلوم ہوتا ہے کہ سربراہ مملکت اور خلیفہ رسول اللہ کی حیثیت سے سیدنا ابوبکرؓ جو ذمہ داریاں ادا کر رہے تھے ان کے حق میں دلائل اور اپنے اقدامات کی حکمت انہوں نے واضح فرمائی اور یہ بتایا کہ میرے یہ اقدامات شریعت کے فلاں فلاں نصوص پر مبنی ہیں۔ لہٰذا اس روایت سے امیر کے لئے ویٹو کا حق تو ثابت نہیں ہوتا البتہ اس سے یہ استدلال کیا جا سکتا ہے کہ امیر کے لئے اپنے ان اقدامات کو شوریٰ کے سامنے پیش کرنے کی ضرورت نہیں جو وہ شریعت کے احکام کے نفاذ کیلئے کر رہا ہو۔ نیز اسلامی مجلس شوریٰ کو بھی یہ حق حاصل نہیں کہ وہ شریعت کے واضح احکام کو موضوع بحث بنائے۔ البتہ افہام و تفہیم کی غرض سے وہ امیر کے نقطہ نظر کو سمجھنے کے لئے اس سے وضاحت طلب کر سکتی ہے۔

امین احسن اصلاحی

تعلق باللہ اور اُس کی اساسات۔۲

عبادت

خدا کے ساتھ ہمارے تعلق کی دوسری بنیاد عبادت ہے۔ بندے کے اندر جب اپنے منعم حقیقی کے لیے شکر کا جذبہ پیدا ہوا تو یہ جذبہ قدرتی طور پر منعم کے لیے اظہار احسان مندی اظہار نیازمندی اور اظہار بندگی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ انسان کی فطرت کی ساخت ہی کچھ ایسی ہے کہ اپنے منعم و محسن کے لیے اس کی طرف سے آپ سے آپ یہ بات ظاہر ہوتی ہے۔ انسان تو انسان حیوانات تک کی جبلت کا بھی یہی حال ہے۔ کتے، بلی، گھوڑے، گدھے جس کی بھی آپ پرورش کیجئے اور جس پر بھی کوئی احسان کیجئے ناممکن ہے کہ وہ آپ کو دیکھیں اور آپ کے سامنے اپنی نیازمندی اور اپنی ممنونیت کا اظہار نہ کریں۔ یہ ممنونیت ان کی آواز، ان کی حرکات اور اُن کی صورت و ہیئت ہر چیز سے ظاہر ہوتی ہے۔

یہ چیز انسان کی فطرت کے اندر حیوانات کی جبلت کے لحاظ سے زیادہ نمایاں ہے اور زیادہ نمایاں ہونی چاہیئے بھی۔ چنانچہ آپ دیکھتے ہیں کہ جس کا بھی ہم پر کسی طرح کا کوئی احسان ہوتا ہے، ہم اس کے احسان پر اپنی ممنونیت کا اظہار اپنی زبان سے بھی کرتے ہیں اور اپنی صورت و ہیئت سے بھی۔ جو لوگ محسن کے احسان کا یہ حق ادا نہیں کرتے وہ ہمارے اندر کمینے اور نا احسان شناس سمجھے جاتے ہیں۔ ہمارا یہ رویہ اپنے عام محسنوں کے ساتھ ہوتا ہے یا ہونا چاہیئے اور یہی رویہ فطرتِ انسانی کا حقیقی تقاضا ہے۔ پھر اسی سے اندازہ کیجئے کہ اس ذات کے انعامات و احسانات کے مقابل میں ہمارا کیا رویہ ہونا چاہیئے جو نہ صرف تمام انعامات و احسانات ہی کا منبع ہے بلکہ خود ہمارے وجود کا سرچشمہ بھی ہے اور جس کے انعامات

احسانات عارضی اور وقتی نہیں ہیں بلکہ دائمی اور ابدی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اپنے حقیقی محسن و مربی کے لیے بندہ اپنی کامل نیازمندی اور کامل بندگی کا اظہار کرنا چاہے گا۔ اگر اس نے اپنی فطرت میں کوئی خرابی نہیں پیدا کرلی ہے تو یہ چیز عین اس کی فطرت کا مطالبہ ہے جس کو پورا کیے بغیر وہ دل کا اطمینان اور رُوح کا سکون حاصل ہی نہیں کر سکے گا۔ اگر کسی کے اندر یہ چیز ظاہر نہ ہو رہی ہو تو غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس کے دل کے اُوپر یا تو غفلت کا حجاب ہے یا حماقت کا۔ غفلت کی حقیقت تو اس سلسلۂ مباحث میں مختلف مواقع پر ظاہر کی جا چکی، اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ رہی حماقت تو اس سے ہماری مراد یہ ہے کہ بہت سے لوگ ان اسباب و وسایط ہی کو سب کچھ سمجھ بیٹھتے ہیں جو ان کے اور حقیقی منعم کے درمیان حائل ہوتے ہیں۔ حقیقی منعم کا یا تو ان کو کوئی خیال ہی نہیں ہوتا اور اگر ہوتا ہے تو بالکل ضمنی اور محض سرسری طور پر۔

اسی اظہارِ ممنونیت و نیازمندی اور اسی اظہارِ تذلل کو عبادت کہتے ہیں۔ یہ اظہار زبان، حرکات اور صورت و ہیئت ہر چیز سے ہوتا ہے، جب تک ہر چیز سے یہ اظہار نہ ہو اس کی اصل حقیقت وجود پذیر نہیں ہو سکتی اس وجہ سے آدمی کی عبادت کی تکمیل میں اس کی ہر چیز کسی نہ کسی نوعیت سے شریک ہوتی ہے سر سے لے کر پاؤں تک اس کے جتنے بھی اعضا و جوارح ہیں سب اس میں اپنا حصہ ادا کرتے ہیں، اسی طرح اس کے اندر جتنی بھی عقلی و روحانی قابلیتیں ہیں سب اس میں اپنا نذرانہ پیش کرتی ہیں، بلکہ اس کی حقیقی تکمیل ہوتی ہی اس وقت ہے جب آدمی اپنے ان وسائل و ذرائع کو بھی اس کام میں شریک کرے جن سے وہ اس دُنیا میں اپنی ضروریات، اپنی خواہشوں اور منصوبوں کی تکمیل کرتا ہے۔

یہ بات کچھ زیادہ دلیل کی محتاج نہیں ہے کہ خدا کی عبادت درحقیقت اس جذبۂ شکرگزاری کا مظہر ہے جو اپنے منعمِ حقیقی کے لیے بندے کے اندر پیدا ہوتا ہے۔ اس کا سب سے زیادہ واضح ثبوت سورۂ فاتحہ ہے جو اپنے موضوع کے اعتبار سے شکر کی سورہ ہے اور اس کو اسلام کی سب سے بڑی عبادت نماز کی خاص سورہ قرار دیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں فاتحہ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بندے پر خدا کی ربوبیت اور اس کی رحمانیت و رحیمیت کی شانوں کے مشاہدے سے شکرگزاری کا جو جذبہ طاری ہوتا ہے اس کا پہلا تقاضا جو اس کی زندگی میں نمایاں ہوتا ہے۔ وہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ (ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں) کا اقرار ہے۔

قرآن مجید کے دوسرے مواقع سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی عبادت درحقیقت خدا کی شکرگزاری ہی کی عملی صورت ہے۔ مثلاً فرمایا ہے:

فَاعْبُدْ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ (۶۶ زمر) بلکہ اللہ ہی کی بندگی کر اور اس کے شکرگزاروں میں سے بن۔

دوسری جگہ فرمایا ہے:

وَاعْبُدُوْهُ وَاشْكُرُوْا لَهٗ (۱۷ عنکبوت) اور اس کی بندگی کرو اور اس کے شکرگزار بنو۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق روایات میں آتا ہے کہ آپ رات میں نمازوں میں اتنی اتنی دیر تک قیام فرماتے کہ آپ کے دونوں پاؤں سوج سوج جاتے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے پوچھا کہ رسول اللہ جب آپ کے تمام اگلے اور پچھلے گناہ بخشے جا چکے ہیں تو آپ اتنی مشقت کیوں اٹھاتے ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ کیا میں یہ بات نہ چاہوں کہ خدا کا شکرگزار بندہ بنوں (متفق علیہ)

اس سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ عبادات میں اصل محرک خدا کی شکرگزاری کا احساس اور جذبہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اگر ہمیں اپنی عبادت کا حکم دیا ہے تو اس لیے نہیں کہ اس کو یہ بات پسند آئی کہ وہ ہمیں کسی مشقت اور زحمت میں مبتلا کرے بلکہ اس نے یہ پسند فرمایا کہ ہمارے جذبۂ شکرگزاری کے اظہار کے لیے ایسی شکلیں معین فرما دے جو اس کی نگاہوں میں پسندیدہ اور ہمارے لیے زیادہ سے زیادہ نافع اور موجب خیر و برکت ہیں۔

عبادت کی اس رُوح کے لحاظ سے حقیقی عبادت وہی ہے جو خدا کی شکرگزاری کے سچے جذبے کے ساتھ ادا کی جائے، اگر کوئی عبادت اس جذبے سے خالی ہو، آدمی اس کو ایک بار اور ایک مصیبت سمجھ کر کسی نہ کسی طرح اس سے جان چھڑانے کی کوشش کرے تو یہ عبادت وہ عبادت نہیں جو خدا کے ہاں قبولیت کا درجہ حاصل کرے۔

اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ بندہ خدا کی عبادت کر کے درحقیقت وہ سب سے بڑا حق ادا کرتا ہے جو اس کے خالق و مالک اور منعم و محسن پروردگار کا اس کے اوپر عاید ہوتا ہے اور یہ حق وہ اس لیے ادا نہیں کرتا کہ اس میں اس کے خالق و مالک کا کوئی نفع ہے بلکہ محض اس لیے ادا کرتا ہے کہ اس میں خود اس کا اپنا سراسر نفع ہے، اس طرح وہ اپنے آپ کو ان انعامات کا مزید سزاوار بناتا ہے جو اس کو اس کے رب کی جانب سے بلا کسی استحقاق کے حاصل ہیں۔ قرآنِ مجید کی متعدد آیات سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ خدا کی عبادت درحقیقت اس لیے کی جاتی ہے کہ وہ خالق، مالک ہے، مربی ہے، پروردگار ہے، نہ اس لیے کہ اس کے کرنے سے خدا کو کوئی نفع پہنچتا ہے یا نہ کرنے سے اس کو کوئی نقصان پہنچتا ہے،

چند آیتیں ملاحظہ ہوں :

وَمَالِيَ لَآ اَعۡبُدُ الَّذِيۡ فَطَرَنِيۡ (یٰسٓ) — اور مجھے کیا ہوگیا ہے کہ میں اس ذات کی عبادت نہ کروں جس نے مجھے پیدا کیا ہے ۔

اُعۡبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيۡ وَرَبَّكُمۡ (۷۲ - مائدہ) — اور اللہ کی بندگی کرو جو میرا رب بھی اور تمہارا رب بھی ہے ۔

خَالِقُ كُلِّ شَيۡءٍ فَاعۡبُدُوۡهُ (۱۰۳ - انعام) — وہ ہر چیز کا خالق ہے تو اسی کی بندگی کرو۔

اِنَّنِيۡۤ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعۡبُدۡنِيۡ (۱۴ - طٰہٰ) — بے شک میں ہی اللہ ہوں، نہیں ہے کوئی معبود مگر میں تو میری ہی بندگی کرو۔

مذکورہ بالا آیات سے صاف واضح ہے کہ خدا کی عبادت اس لیے واجب ہے کہ وہی خالق و فاطر ہے، اس لیے واجب ہے کہ وہی رب اور مالک ہے، اس لیے واجب ہے کہ وہی تنہا معبود ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے ۔

اللہ تعالیٰ اگر ہماری اس عبادت سے خوش ہوتا ہے تو اس لیے نہیں کہ اس سے اس کو کوئی نفع پہنچتا ہے، اسی طرح اگر وہ عبادت نہ کرنے سے ناخوش ہوتا ہے تو اس لیے نہیں کہ اس سے اس کو کوئی نقصان پہنچتا ہے۔ وہ ہر قسم کے نفع و نقصان سے بالکل بے نیاز ہے۔ ایک حدیثِ قدسی میں وارد ہے کہ :

" اے میرے بندو! اگر تمھارے اگلے اور پچھلے اور جنّات اور انسان سب کے سب زیادہ سے زیادہ متقی بن جائیں جب بھی وہ میری بادشاہی میں کوئی اضافہ نہیں کریں گے ۔ اے میرے بندو، اگر تمھارے اگلے اور پچھلے اور جنّات اور انسان سب کے سب مل کر زیادہ سے زیادہ نافرمان بن جائیں جب بھی وہ میری بادشاہی میں کوئی کمی نہیں کریں گے ۔ (مسلم)

اللہ تعالیٰ کے ہماری عبادت سے خوش ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس طرح بندہ ترقی اور کمال کے اس راستہ پر چل پڑتا ہے جس پر چلنے اور جس کو حاصل کرنے ہی کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس کو پیدا کیا ہے ۔ بندے کا ترقی و کمال کی راہ میں پہلا قدم ہمارے خالق و مالک کے نزدیک یہی ہے کہ ہم سب سے پہلے اس کے اس حق کو پہچانیں ۔ اگر ہم نے یہ پہلا قدم صحیح اٹھا دیا تو آگے کی راہ آپ سے آپ کھلتی جائے گی اور اگر خدانخواستہ یہ پہلا ہی قدم نہ اٹھایا، اٹھا لیکن غلط اٹھا تو پھر آگے کوئی قدم بھی صحیح اٹھنے کی توقع نہیں ہے۔

پھر انسان جو قدم بھی اٹھائے گا غالب یہی ہے کہ وہ غلط اٹھائے گا اور جتنا ہی آگے بڑھتا جائے گا وہ خدا کی راہ سے دور اور شیطان کی ٹھہرائی ہوئی منزلِ مقصود سے قریب تر ہوتا جائے گا۔

اطاعت

عبادت کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے تعلق کو استوار رکھنے کے لئے اس کی اطاعت بھی ضروری ہے۔ اسلام میں ہندویت اور عیسائیت کی طرح خدا صرف پوجا پاٹ ہی کا حق دار نہیں ہے بلکہ اطاعت اور فرمانبرداری کا بھی حق دار ہے۔ اطاعت سے مطلب ان قوانین و احکام کی اطاعت ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے اپنے بندوں کی انفرادی زندگی کی درستگی اور ان کی اجتماعی زندگی کی تنظیم کے لئے اتارے ہیں۔

اس اطاعت کے لئے سب سے پہلے تو عقل مطالبہ کرتی ہے کیونکہ یہ بات بالبداہت عقل کے خلاف ہے کہ انسان جس ہستی کو اپنی عبادت کا مستحق تسلیم کرے، اس کے احکام و قوانین کی اطاعت سے بے پروا رہے یا ان کا انکار کرے۔ اگر معبود ہستی نے کوئی حکم اور قانون دیا ہی نہ ہو (جس کا معبودِ حقیقی کے بارے میں تصور نہیں کیا جا سکتا) تب تو اور بات ہے لیکن اس معبود ہستی نے اگر کچھ احکام و قوانین دیئے ہیں تو انسان کی عقل اس سے یہ مطالبہ کرتی ہے کہ وہ جس کو عبادت کا مستحق سمجھتا ہے اسی کو اطاعت کا بھی مستحق سمجھے۔ عبادت کسی کی کرنا اور اطاعت کسی اور کی کرنا دونوں باتوں میں ایک کھلا ہوا تضاد ہے۔ جس پر صرف وہی شخص مطمئن ہو سکتا ہے جس کی عقل میں بہت بڑا فتور واقع ہو گیا ہو۔

دوسرے درجہ میں اس کا مطالبہ، جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، اسلام کی ظاہری شکل و صورت کرتی ہے۔ اسلام کو جو شخص تھوڑا بہت جانتا ہے وہ اس حقیقت سے کسی طرح بھی انکار کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ اسلام کے خدا نے صرف اپنی پرستش ہی کا مطالبہ نہیں کیا ہے بلکہ اپنی اطاعت کا بھی مطالبہ کیا ہے۔ اس نے لوگوں کو نماز پڑھنے، روزہ رکھنے اور زکوٰۃ دینے ہی کے احکام نہیں دیئے بلکہ معاملات، کاروبار، زراعت، تجارت، سیاست

سے متعلق بھی بہت سے واضح اور قطعی احکام و قوانین دیئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ احکام و قوانین اس نے اسی لئے دیئے ہیں کہ ان کی اطاعت کی جائے، اگر ان کی اطاعت مطلوب نہیں ہے تو پھر ان احکام کے دینے کا فائدہ ہی کیا؟ چنانچہ اسی بنیاد پر قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۴۴ - مائدہ)

اور جو لوگ اس کے مطابق فیصلے نہ کریں جو اللہ نے اتارا ہے تو وہی لوگ کافر ہیں۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (۴۵ - مائدہ)

اور جو لوگ اس کے مطابق فیصلے نہ کریں جو اللہ نے اتارا ہے تو وہی لوگ ظالم ہیں۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (۴۷ - مائدہ)

اور جو لوگ اس کے مطابق فیصلے نہ کریں جو اللہ نے اتارا ہے تو وہی لوگ فاسق ہیں۔

اسی وجہ سے قرآن مجید میں صرف اعبدوا ربکم ہی کا حکم نہیں آیا ہے بلکہ بار بار **اطیعوا اللّٰہ** کا حکم بھی آیا ہے جس کے معنی یہی ہیں کہ اللہ کے قانون کی اطاعت کرو۔

قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ (۳۲ - آل عمران)

کہہ دو، اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی پس اگر وہ اس اطاعت سے اعراض کریں گے تو اللہ کافروں کو دوست نہیں رکھتا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ (۵۹ - نساء)

اے ایمان والو، اللہ کی اطاعت کرو، اور رسول کی اور اپنے اولوالامر کی۔

اس اطاعت کی عملی شکل درحقیقت رسول کی اطاعت ہے اس لئے کہ رسول ہی ہے جو خدا کے نائب کی حیثیت سے خدا کے احکام و قوانین سے باخبر کرتا اور اُن کی تنفیذ کرتا ہے چنانچہ قرآن مجید میں جہاں جہاں بھی **اطیعوا اللّٰہ** وارد ہے ساتھ ہی **اطیعوا الرسول** کا بھی حکم ہے۔ اس وجہ سے خدا اور رسول کے درمیان فرق کرنے کے لئے اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے جو لوگ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کو تسلیم کرتے ہیں لیکن رسول کی اطاعت تسلیم نہیں کرتے ان کی مثال بالکل ایسی ہے کہ وہ بادشاہ کی اطاعت تو تسلیم کرتے ہیں لیکن اس کے مقرر کئے ہوئے نائب کی اطاعت تسلیم کرنے

کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی خود مختاری کی گنجائش نہ تو دنیا کے قوانین میں کہیں تسلیم کی گئی ہے اور نہ خدا ہی نے اپنے قانون میں اس کے جواز کی کوئی گنجائش رکھی ہے۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (۶۵ - نساء)

پس نہیں، تیرے رب کی قسم یہ لوگ مومن نہیں ہیں جب تک یہ تمہارا فیصلہ نہ قبول کریں۔ ان نزاعات میں جو ان کے درمیان پیدا ہوں، پھر وہ اپنے دلوں میں تمہارے فیصلہ سے کوئی تنگی بھی نہ محسوس کریں اور پوری طرح تمہاری اطاعت کریں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی اس اطاعت سے دو شکلوں کے سوا کسی شکل میں بھی انحراف کی گنجائش نہیں رکھی ہے ایک بھول چوک یا کسی جذبہ سے مغلوبیت، دوسرے مجبوری۔ پہلی صورت کا علاج استغفار اور توبہ اس نے بتایا ہے اور دوسری صورت کا علاج امکان کی حد تک اس مجبوری کی اصلاح یا اس سے نکلنے کی جد و جہد۔ ان شکلوں کے سوا خدا کی اطاعت سے انحراف اختیار کرنے والا اللہ تعالیٰ سے اپنا تعلق ہی منقطع کر لیتا ہے۔

مسلمان جہاں کہیں بھی اس پوزیشن میں ہوں کہ وہ خدا کے قانون کا نفاذ کر سکیں ان کے اوپر یہ واجب ہے کہ وہ خدا ہی کے قانون کو نافذ کریں اور اسی کی اطاعت کریں۔ جو نظام خدا اور رسول کے قانون پر مبنی ہو اور خدا و رسول کے احکام ہی کے نفاذ کے لئے وجود میں آیا ہو اسلام میں اس کا درجہ بہت اونچا ہے اس نظام کے چلانے والے اولوالامر درحقیقت رسول کے خلفا کی حیثیت رکھتے ہیں، اس وجہ سے ان کی اطاعت واجب ہے۔ اوپر ہم نے سورہ نساء والی آیت جو نقل کی ہے اس میں اولوالامر سے ایسے ہی اولوالامر مراد ہیں۔ ایسے اولوالامر کی اطاعت سے اگر کوئی شخص انحراف اختیار کرے تو وہ گویا خدا اور رسول کی اطاعت سے انحراف

اختیار کرتا ہے، ایک حدیث ملاحظہ ہو:

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من اطاعنی فقد اطاع اللہ ومن اطاع الامام فقد اطاعنی ومن عصانی فقد عصی اللہ ومن عصی الامام فقد عصانی

ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے صاحب امر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی اور جس نے صاحب امر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔

اس حدیث سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ خدا کی اطاعت کے لئے رسول کی اطاعت ضروری ہے اور رسول کی اطاعت کے لئے اسلامی نظام کے صاحبِ امر کی اطاعت شرط لازم جس نے رسول کی اطاعت نہیں کی اس نے خدا کی اطاعت نہیں کی اور جس نے صاحب امر کی اطاعت نہیں کی وہ رسول کی اطاعت سے محروم رہا۔

اسلامی نظام اطاعت کی یہ تینوں کڑیاں ایک دوسری سے الگ نہیں کی جا سکتی ہیں۔ یہ تینوں درحقیقت ظاہر میں تین ہیں اور الگ الگ نظر آتی ہیں، حقیقت میں یہ تینوں ایک ہی ہیں کیونکہ مقصود بالذات تو درحقیقت اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے بقیہ دونوں تو اس کا وسیلہ و ذریعہ ہیں۔

اسلام نے اپنے نظام اطاعت میں اولوالامر کو یہ بلند منصب جو دیا ہے تو اس منصب کا بدیہی تقاضا یہ ہے کہ وہ خود خدا کے قانون کی اطاعت کریں اور اس کے بندوں کے اندر اسی کے قانون کو جاری و نافذ کریں۔ جس طرح رسولؐ کو یہ بات دل و جان سے زیادہ عزیز و محبوب تھی کہ لوگ خدا کے قانون کی اطاعت کریں اسی طرح انہیں بھی یہ بات محبوب ہو کہ لوگ خدا اور رسولؐ کے احکام کی اطاعت کریں اور جس طرح رسولؐ کے نزدیک یہ چیز مبغوض تھی کہ لوگ اللہ کی اطاعت سے انحراف اختیار کریں اسی طرح ان کے نزدیک بھی یہ چیز مبغوض ہو کہ لوگ خدا اور رسولؐ کی اطاعت سے

باقی صفحہ ۴۸ پر ملاحظہ فرمائیں

امین احسن اصلاحی

معاشی دائرے میں فرد اور ریاست کا کردار

سوال:۔ آج کل معاشی مسائل کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ کیا فی الواقع ان کی یہی اہمیت ہے؟ آپ کے نزدیک معاشی دائرے میں اسلام کا مزاج کیا ہے؟

جواب:۔ انسان کی زندگی میں معاش کو یقیناً بڑی اہمیت حاصل ہے لیکن اسے کُل نہیں سمجھنا چاہیئے۔ انسان کے لئے پیٹ یقیناً ایک بڑا عنصر ہے لیکن پیٹ ہی کُل ہے، یہ بات میں ماننے کے لئے تیار نہیں۔ یہ صحیح فکر اس وقت پیدا ہوتا ہے جب پورے انسانی مقتضیات و داعیات پر پورے توازن کے ساتھ غور کیا جائے۔ اس طرح غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ پیٹ کا اصل کام چاہنا اور خواہش کرنا ہے۔ سوچنا اس کا کام نہیں۔ سوچنا، غور کرنا اور فکر کرنا الگ چیز ہے۔ اور انسانی زندگی کا اصل اہم عنصر وہی ہے جس سے انسان حیوان سے ممیز ہوتا ہے۔ پیٹ کی حیثیت کے ضمن میں اس دور میں جو بحران پایا جاتا ہے میرے نزدیک وہ مصنوعی ہے اور یہ تمام تر کمیونزم کا پیدا کردہ ہے۔ کمیونسٹوں نے معاشی مسئلوں کو کُل کی اہمیت دیدی ہے۔ اسے اس کے اصل مقام پر نہیں رکھا جس کا وہ حقدار ہے۔ اسلام نے بھی معاشی مسئلے کو اہمیت دی ہے لیکن اسے اس کے متعین مقام پر ہی رکھا ہے۔ اور یہی صحیح بات ہے۔

انسان کے اندر جن چیزوں کے لئے تحریک موجود ہے اور ضرورت سے زیادہ موجود ہے، اسلام کا مزاج یہ ہے کہ ان پر صرف کچھ حد بندیاں عائد کرنا چاہتا ہے تاکہ وہ چیزیں اپنے جائز حدود سے تجاوز نہ کریں۔ مثلاً انسان کے اندر جنس کی خواہش ہے جو بے لگام ہو سکتی ہے تو اس کے اوپر کچھ حدیں قائم کر دی گئی ہیں۔ شادی اور نکاح پر گھروں کے اندر آنے جانے پر سوسائٹی میں مرد اور عورت کے ملنے جلنے پر کچھ حدیں عائد کر دی گئی ہیں تاکہ جنسی خواہشات اپنے حدود کے اندر ہی رہیں۔ اب اگر اس جنس کے مسئلے ہی کو کُل بنا دیا جائے، جیسا کہ بعض فلسفیوں نے کیا ہے، تو انسانی معاشرے کا پورا نظام تلپٹ ہو جائے گا۔

پیٹ کے معاملے میں بھی صورت حال یہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کو یہ بتانے کی تو ضرورت نہ تھی کہ یوں کماؤ، یوں زمین کو کھودو، یوں جوتو، یوں بوؤ، یوں کاٹو۔ یہ سب تو انسان خود بخود کر سکتا ہے اور کسی کے بتائے بغیر رات دن یہی کرتا ہے۔ اس معاملے میں ضرورت تھی تو یہ تھی کہ انسانی جدوجہد کی حدود معین کر دی جائیں کہ آپ کی معاشی دلچسپیاں کہاں تک رہنا چاہئیں۔ اسلام کی مداخلت معاشی نظام کے متعلق بھی اسی حیثیت سے ہے۔

یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ بہر حال انسان کی اختیاری نیکی کے اندر جو فضیلت موجود ہے اور جو زندگی ہے وہ انسان کی جبری نیکی کے اندر نہیں ہے۔ انسان نیک بن سکتا ہے تو اپنی آزادانہ نیکی سے بن سکتا ہے۔ جبری نیکی سے نہیں بن سکتا۔ انسان روزی کما کر اسے خرچ کرتا ہے تو اس بارے میں نبیوں کی صحیح تعلیم یہ ہے کہ آدمی کو بیک وقت نہایت کفایت شعار اور انتہائی فیاض ہونا چاہیئے۔ یعنی وہ دوسروں کے لئے انتہائی فیاض اور اپنے لئے نہایت کفایت شعار ہو۔ اور یہ کام اسے پوری آزادی کے ساتھ کرنا چاہیئے، مارے باندھے نہیں۔ باندھ کر تو آپ انسان کا سب کچھ لے سکتے ہیں لیکن یہ تو ایسا ہی ہے، کہ جیسے کچھ ڈاکو آئے، حملہ کیا اور ایک شخص کا سب کچھ چھین کر لے گئے۔ اس طریقہ سے انسان سے دولت تو لے لی جائے گی لیکن وہ نیک نہیں بن جائے گا۔ اسی طرح اگر آپ معاشرے کے تمام افراد کو ناپ تول کھانا دیتے ہیں، جیسے جیل میں دیا جاتا ہے تو اس سے یہ تو ہو گا کہ بہر حال کوئی شخص کسی دوسرے کی روٹی چھین نہیں سکے گا لیکن یہ بھی ہے کہ وہ کوئی صالح بندہ نہیں بن جائے گا۔

اچھے معاشی نظام میں یہ کام معاشرے کا ہوتا ہے کہ لوگوں کو تربیت اس انداز سے ہو کہ ان کے اندر یہ جذبہ خود پیدا ہو کہ وہ اپنے مال کو زیادہ سے زیادہ دوسروں کی خدمت میں صرف کریں۔ وہ غریبوں اور محتاجوں کی مدد کریں۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے متعلق یہ بات کہی جاتی ہے کہ انہوں نے فرمایا: "کوئی اگر تیرا قمیص مانگے تو اپنا چغہ بھی اتار کر دے دے۔" بعض لوگ اس پر تعجب کرتے ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ کوئی اس پر ذرا عمل کر کے دیکھے تو اس کو پتہ چلے کہ جس کے دل کی کیفیت یہ ہو جائے گی کہ کوئی اس سے قمیص مانگے تو وہ اپنا چغہ دینے کو بھی تیار ہو جائے تو

یقیناً ایسا شخص ننگا نہیں رہے گا۔ وہ پہنے گا بھی اور پہنائے گا بھی۔ یہ ایک غلط سوچ کا نتیجہ ہے کہ لوگ ایسا کرنے کو مناسب نہیں سمجھتے۔ لیکن ذہن کی اُفتاد فی الحقیقت یہی ہونی چاہیئے۔ اپنی تربیت اس انداز سے کرنی چاہیئے کہ اگر ایک انسان مجھ سے کوئی ایک چیز مانگتا ہے تو اپنی دوسری چیز بھی اسے دینے کے لئے تیار رہوں۔ مذہب میں نیکی کا جو تصور ہے وہ یہی ہے۔ کوئی معاشی نظام بھی حرص مال، حب مال اور ایسی ہی دوسری چیزوں کے ساتھ نیکی کا ضامن نہیں ہو سکتا۔

ایک اسلامی ریاست میں حکومت کی اصل ذمہ داری ان لوگوں کے لئے روٹی، کپڑا مکان، عدل وانصاف اور امن مہیا کرنا ہے جو ان تمام سہولتوں سے محروم ہیں۔ یا انہیں ان پہلوؤں میں کسی طرح بھی نقصان پہنچ رہا ہے۔ حقیقت میں اسلامی نقطۂ نظر سے مملکت غریبوں، مسکینوں اور یتیموں کی متولی ہوتی ہے۔ یعنی وہ ان کی ضروریات کی ذمہ دار ہے۔ وہ ان کی روٹی کی، ان کے کپڑے کی، ان کے مکان کی، ان کی عزت و آبرو کی حفاظت کی، ان کی شادی بیاہ کی اور ان کی تعلیم و تربیت کی ذمہ دار ہے۔ باقی رہ گئی یہ بات کہ شاندار سڑکیں بھی بننی چاہئیں اور شہروں میں ترقیاں بھی ہونی چاہئیں۔ رفاہیت کے سامان فراہم کئے جانے چاہئیں تو اس کے لئے آپ کو روپیہ فراہم کرنا ہو گا۔ مملکت کا کام یہ ہے کہ وہ اس کے لئے مناسب انتظام کرے لیکن اپنی اصل ذمہ داری سے سبکدوش ہونا اس کے لئے ضروری ہے۔ وہ غریبوں کے لئے برابر فکر مند رہے گی۔ اور اس فرض کو انجام دینے کے لئے اسلام نے حکومت کے اختیار میں بہت کچھ دے دیا ہے۔ اگر حکومتیں اپنی اصل ذمہ داری کو تو محسوس نہ کریں اور دوسری شاہ خرچیوں پر روپیہ خرچ کریں تو یہ انکی غلطی ہے۔ ان کو اس کا حق نہیں پہنچتا۔ وہ ہر غریب کے بچے کی تعلیم کی، ہر غریب کی روٹی کی، اور ہر غریب لڑکی کے نکاح اور شادی کی ذمہ دار ہیں۔

اسلامی ریاست کا جو منشاء میں سمجھتا ہوں، وہ تو یہی ہے۔ اسلام میں خلیفہ حقیقت میں غریبوں ہی کے اندر کا ایک فرد ہوتا ہے اور اپنے کو ایسا سمجھتا بھی ہے۔ وہ ان کا وکیل ہوتا ہے۔ اگر لوگوں میں انفاق کی تربیت نہ ہو تو جہاں تک اسباب حکومت کا تعلق ہے، ان کو تقریر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ تو لوگوں کو جو کچھ بھی بنانا چاہیں، خود بن جائیں لوگ اپنے آپ ہی سدھر جائیں گے۔

عمل خیر اور عمل شر

سوال:۔ کسی عمل کے خیر اور شر ہونے سے کیا مراد ہے؟ کیا شر کا منبع خود انسان کے اندر ہے یا خارج میں ہے؟ کیا شر اللہ تعالیٰ کے اذن سے وجود پذیر ہوا ہے؟

جواب:۔ عمل کے خیر اور شر ہونے سے کیا مراد ہے؟ اس کا ایک جواب تو فلسفیانہ ہے۔ یعنی علمائے فلسفۂ اخلاق بھی اس موضوع پر بحث کرتے ہیں کہ کوئی عمل خیر کیسے ہوتا ہے اور شر کیونکر؟ لیکن میں اس مسئلے کا جائزہ فی الوقت فلسفیانہ نقطۂ نگاہ سے نہیں لینا چاہتا۔ میرے نزدیک، جو عمل اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند ہے اور جس کا انہوں نے حکم دیا ہے وہ خیر ہے اور جو اللہ تعالیٰ اور رسولؐ کو پسند نہیں ہے اور جس سے انہوں نے روکا ہے وہ شر ہے۔ یہ وہ کسوٹی ہے جس کو ہر عام آدمی بھی استعمال کر سکتا ہے۔ عمل خیر میں سب کی بھلائی ہوتی ہے اور عمل شر میں کسی کی بھلائی ہو بھی تو وہ آدمی کی ذاتی ہوتی ہے، انجام کار اس کا نتیجہ مضر ہوتا ہے۔

شر کا منبع انسان کے اندر ہے یا اس کے خارج میں؟ ظاہر ہے کہ اس کے سارے محرکات انسان کے اندر ہی ہیں اور اگر اس کے محرکات انسان کے اندر نہ ہوتے تو اس کے مسئول ہونے کے بھی کوئی معنی نہ تھے۔ چونکہ ہمارے اندر شر کی خواہشیں اور ان کے محرکات ہیں اس وجہ سے ہم اس کے لئے مسئول ہوتے ہیں۔ البتہ انسان چونکہ ذی ارادہ ہستی ہے اس لئے وہ اپنے محرکات کو کنٹرول بھی کر سکتا ہے۔ محرکات دے دینے کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے اندر صرف شر ہی رکھا ہے اور آپ خیر سے خالی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے شرِ محض کوئی چیز نہیں بنائی۔ مثلاً انسان کے اندر شہوت شر کا ایک اہم محرک ہے لیکن یہ اس کے نوعی بقا کا اہم ستون بھی ہے۔ اس کے اندر غصہ ہے تو یہ عزت و حمیت کے لئے ضروری ہے۔ حمیتِ حق کا تقاضا ہے کہ آدمی اس چیز سے تلملا اٹھے جو صداقت کے خلاف ہے۔ انسان کے اندر حرص ہے تو یہ اس کے لئے ایک عظیم طاقت بھی ہے۔ ان محرکاتِ شر کو قابو میں لانے

کے لئے خدا نے آپ کو عقل اور اختیار دیا ہے۔ یہ اختیار ایک تلوار ہے اور وہ بھی بڑی جوہر دار اور شمشیرِ دودم۔ انسان کا سارا شرف انسان کے اختیار ہی کے اندر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل بھی ودیعت فرمائی ہے۔ یہ عقل انسان کے لئے بندھن ہے۔ اگر انسان عقل کو استعمال کرے تو وہ اپنے آپ کو اپنے محرکات کا تابع بنانے پر مجبور نہیں ہوتا۔ وہ عقل کے ذریعے اپنے محرکات کو گرفت اور کنٹرول میں رکھتا ہے۔ وہ اپنی خواہشات، شہوات، رغبات، الغرض ہر چیز کو کنٹرول میں کر سکتا ہے۔ وہ حرص کو کنٹرول کر سکتا ہے اور اپنے حسد کی بھی تربیت کر سکتا ہے۔ وہ اپنے غصہ پر قابو پا سکتا ہے۔ چنانچہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تربیت کے لئے فرمایا ہے کہ اگر کسی کو غصہ آ جائے اور وہ کھڑا ہو تو بیٹھ جائے اور اگر بیٹھا ہو تو لیٹ جائے۔ بہرحال اس طریقہ سے انسان اگر اپنی تربیت کرتا ہے تو اس کو اپنی تمام منہ زور خواہشوں کو کنٹرول کرنے کی صلاحیت حاصل ہو جاتی ہے۔

جہاں تک شر کے وجود میں آنے کے لئے اللہ تعالیٰ کے اذن کا تعلق ہے جان لیجئے کہ دنیا میں کوئی چیز بھی خداوند تعالیٰ کے اذن کے بغیر وجود میں نہیں آ سکتی۔ البتہ اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ کوئی برائی آپ کرنا چاہیں تو اگر اس کی حکمت کا تقاضا ہوتا ہے تو وہ اس کے لئے ڈھیل دے دیتا ہے۔ گویا کوئی برائی بھی اللہ تعالیٰ کی ڈھیل کے بغیر وجود میں نہیں آ سکتی۔ لیکن خدا کی ڈھیل کے معنی خدا کی پسند کے ہرگز نہیں ہو سکتے۔ خیر اور شر تو اس نے واضح طور پر بتا دیا ہے کہ آپ کو کیا کرنا چاہئے اور کیا نہیں کرنا چاہئے۔ اب اگر آپ اس کے خلاف چلنا چاہتے ہیں تو یہ آپ کی محرومی ہے، اس کی پسند ہرگز نہیں ہو سکتی۔ فرض کر لیجئے کہ آپ چاہتے ہیں کہ اپنی آنکھیں مُوند کے چلیں تو اللہ تعالیٰ اخواہ مخواہ آپ کی آنکھیں نہیں کھولے گا۔ اپنی اس حماقت سے آپ کسی کھڈ میں جا گریں تو اسے اس کی پروا نہ ہو گی۔

مطلب یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے امہال یا ڈھیل کے بغیر کوئی قدم بھی نہیں اٹھا سکتا اس کو آپ اذن کے لفظ سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں، لیکن اذن کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کو وہ پسند بھی ہے۔

قوموں کے عروج و زوال میں کردار کا حصّہ

سوال:۔ تاریخ گواہ ہے کہ دنیا میں حق پر قائم قومیں زیادہ دیر تک عروج پر نہ رہیں، اس

کے برعکس باطل پرست قومیں زیادہ دیر عروج پر رہیں۔ کیا قوموں کا عروج معیارِ حق کے بجائے معیارِ تنظیم پر منحصر ہے۔

جواب :۔ دنیا میں جو قوم بھی قائم رہتی ہے اپنے اعلیٰ کردار کے بل بوتے پر ہی قائم رہتی ہے۔ کردار کو ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ کردار بہرحال حق کا جزو ہے۔ یعنی یہ نہیں ہے کہ کوئی بالکل بے ثبات قوم، جس کے اندر کردار کی ریڑھ کی ہڈی نہ ہو وہ قائم رہے۔ تنظیم، وحدت یہ سب کردار کا حصہ ہیں۔

البتہ ایک کردار تو وہ ہوتا ہے جو مومنانہ کردار کہلاتا ہے، جو انسان کو زمین میں خلافتِ الٰہیہ کا مستحق بناتا ہے۔ اور اس کی حامل قوم زمین کے اوپر خداوند عالم کی رحمت ہوتی ہے۔ اور ایک کردار وہ ہوتا ہے جو قومی کردار یعنی نیشنل کیریکٹر کہلاتا ہے، نیشنل کیریکٹر بہرحال اعلیٰ کردار ہی کا ایک حصہ ہوتا ہے، لیکن وہ ناتمام ہوتا ہے۔ اس میں خدائی روح نہیں ہوتی اس لئے اس کے حاملوں کی حیثیت یہ ہوتی ہے جیسے چوروں کا ایک گروہ جو جتھے کی حیثیت سے طاقت پیدا کر لیتے ہیں، ایک قوت بن جاتے ہیں اور اپنا ایک مقام بھی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں لیکن ان کی یہ وحدت و تنظیم زمین کے لئے رحمت نہیں بلکہ مصیبت بن جاتی ہے۔

دنیا میں چھوٹے بڑے جتنے بھی جتھے ہوتے ہیں وہ کردار ہی کی بدولت ایک دوسرے پر فوقیت رکھتے ہیں۔ کسی کے اندر کردار قوی تر ہوتا ہے تو وہ دوسرے کو پیٹ لیتا ہے اور جس کا کردار کمزور تر ہے اس کو دبنا پڑتا ہے۔ اس دنیا کا عام نظام اسی اصول پر چلتا رہتا ہے۔ یعنی مقابلہ کردار کا کردار سے ہوتا ہے اور مضبوط تر کردار بازی لے جاتا ہے۔

جہاں تک مومنانہ کردار کا تعلق ہے جو قوم اس کی حامل ہوگی وہ زمین میں خدا کی خلیفہ ہوگی۔ ایسی قوم کو خدا کی تائید و نصرت حاصل ہوتی ہے اور اس کو چیلنج کرنا آسان نہیں ہوتا جو اس سے ٹکراتا ہے وہ پاش پاش ہو جاتا ہے۔ لیکن اس قوم کو بھی یہ حیثیت کردار ہی کی بدولت حاصل ہوتی ہے وہ دوسری قوموں پر حکمرانی کا کوئی ابدی پروانہ لے کے نہیں آتی۔ اس لئے کہ خلافتِ الٰہیہ کے منصب پر سرفرازی کی بنیاد بھی بہرحال کردار ہی ہوتا ہے۔ اگر کردار میں زوال پیدا ہو جائے گا تو پھر اس کے

بعد وہ قوم بھی فنا ہو جائے گی۔

ماضی میں مسلمانوں کو جو کچھ حاصل ہوا تھا وہ زمین کی خلافت تھی۔ اس تے واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے دنیا پر حکمرانی کی اور دنیا کے تہذیب و تمدن اور دنیا کی ہر چیز کو متاثر کیا لیکن جب ان کے عقائد میں ضعف پیدا ہوا اور کردار میں کمزوری پیدا ہوئی تو اس کے بعد یہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ اگر اس کے کسی جتھے کے اندر کچھ کیریکٹر باقی رہا تو وہ دوسروں سے کچھ نبرد آزمائی کرتا رہا۔ بعض گروہ اس مہم میں کامیاب ہوئے اور دوسرے ختم ہوتے چلے گئے۔ اس صورت حال کو بدلنے کے لئے ضروری ہے کہ قوم کے افراد میں اعلیٰ مومنانہ کردار پیدا ہو جو دوسری اقوام پر ان کو فوقیت دے سکے اس کے بغیر یہ قوم دوسروں پر برتری حاصل کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔

بقیہ : فہم قرآن کے لئے چند بنیادی اصول

کیوں ہے۔ یہ مقام ایک کشمکش کا مقام ہو سکتا ہے۔ ایسے مقام پر جب ہم اچھی طرح غور کریں گے تو فکر کی وہ خامی معلوم ہو جائے گی جس کے سبب سے مغالطہ ہوا۔ ایسا مغالطہ اللہ تعالیٰ رفع فرما دیتا ہے، انسان کی غلط فہمی دور ہو جاتی ہے اور قرآن کے بیان پر ایمان و یقین محکم ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید عقل کی رہنمائی کے لئے ہے۔ اس لئے جب آپ عقل سے کام لیں گے تب تو اس کی ضرورت پڑے گی اور یہ زندگی کے مسائل حل کرنے میں آپ کو مدد دے گا۔ لیکن اگر آپ عقل کو بالائے طاق رکھ کر قرآن مجید کو پڑھیں گے تو اس سے ثواب تو شاید حاصل کر لیں زندگی کے مسائل کو حل کرنے میں اس سے کوئی مدد حاصل نہیں کر سکتے۔ (جاری ہے)

(ترتیب : عبداللہ غلام احمد)

انحراف اختیار کریں۔

بقیہ : تزکیہ نفس

اسی طرح کے منصب کا ایک بدیہی تقاضا یہ بھی ہے کہ وہ نہ تو خود خدا کے قانون کی نافرمانی کریں اور نہ دوسروں کو کسی ایسی بات کا حکم دیں جو خدا کے حکم کے خلاف ہو۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے بندوں سے اطاعت کا یہ مطالبہ اس بنیاد پر ہے کہ اس کائنات کا حقیقی حکمران وہی ہے۔ بندوں کا حقیقی منصب صرف اطاعت کا ہے اور اگر وہ کوئی تصرف کا حق رکھتے ہیں تو صرف اس کے نائب کی حیثیت سے۔ اس وجہ سے ان کے لئے یہ بات کسی حال میں جائز نہیں ہے کہ وہ اصل حکمران کے حکم کے خلاف کوئی حکم دیں اور اگر وہ ایسا کر بیٹھیں تو وہ اپنا وہ درجہ از خود ختم کر دیتے ہیں جو اسلام نے ان کو بخشا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے احکام سخت بھی ہیں اور نرم بھی ہیں۔ ان پر عمل کرنے اور عمل کرانے میں بسا اوقات نہایت مشکل حالات اور صبر آزما رکاوٹوں سے سابقہ پیش آتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کا مطالبہ بندوں سے یہ ہے کہ وہ ہر طرح کے حالات میں اسی کی اطاعت کریں جو لوگ صرف انہی باتوں میں خدا کی اطاعت کرنا چاہتے ہیں جن کو وہ اپنی خواہشوں یا مصلحتوں کے مطابق پاتے ہیں، جن باتوں کو وہ اپنی خواہشوں اور مصلحتوں کے مطابق نہیں پاتے ان کی اطاعت سے گریز کی راہیں نکالتے ہیں یا ان میں تحریف کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ان کی اطاعت کو اللہ تعالیٰ نے قبول نہیں فرمایا ہے بلکہ ایسے لوگوں کو اپنے غضب اور اپنی لعنت کا مستحق قرار دیا ہے۔ پچھلی امتوں میں اس کی مثال یہود ہیں۔ یہود نے اللہ تعالیٰ کی شریعت کی بہت سی باتیں اپنی خواہشات اور اپنے مصالح کے خلاف سمجھ کر بدل ڈالیں، انہوں نے اپنے گمان کے مطابق خدا کی شریعت کو زمانے کے حالات کے مطابق ایک ترقی یافتہ شریعت کی شکل میں ڈھالنے کی کوشش کی لیکن اللہ تعالےٰ نے اپنی شریعت میں اُن کی اِن اصلاحات کو نہ صرف یہ کہ قبول نہیں فرمایا، بلکہ ان کی اس جسارت کی پاداش میں ان کو اپنی شریعت ہی سے محروم کر دیا اور ان پر لعنت کر دی۔

(جاری ہے)